ISSN - 2582-4619 - VOL 63 - ISSUE 20,21
25 AUGUST, 10 SEPTEMBER 2026
TAMEER-E-HAYAT

تعمیرِ حیات
لکھنؤ
پندرہ روزہ

دینی حکمت کا تقاضا

''ہم مسلمانوں کو اس حقیقت کو اب سمجھ لینا چاہیے کہ اگر سو فی صد مسلمان تہجد گزار ہو جائیں، ہر مسلمان کے ہاتھ میں تسبیح آجائے اور ہر مسلمان اشراق اور چاشت کا پابند ہو جائے، لیکن اگر اکثریت اس سے نامانوس ہے، اکثریت اپنے دل میں اس کی طرف سے زہر لیے بیٹھی ہے اور سینے میں انگارے سلگ رہے ہیں، تو خدانخواستہ جس وقت اس ملک میں کوئی بھونچال آئے گا، تو ہم اپنی تمام عبادتوں اور نوافل کے ساتھ بے دخل ہو جائیں گے۔ اس وقت نوافل تو نوافل، جو بنیادی چیزیں ہیں، وہ بھی نہیں رہیں گی۔ اس لیے دینی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس آبادی کو اپنے سے مانوس بنائیں، اسلام کا پیغام گھر گھر پہنچائیں، ان کو بتلائیں کہ اسلام کیا ہے؟''

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

سالانہ زرِ تعاون ₹500
۲۵ر اگست، ۱۰ر ستمبر ۲۰۲۶ء
یہ شمارہ -/40₹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ — ۲۵/اگست-۱۰/ستمبر ۲۰۲۶ء مطابق ۱۱-۲۷/ربیع الاول ۱۴۴۷ھ — شمارہ نمبر ۲۰-۲۱

فیضانِ نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

اسلام نے پہلا مدرسہ ہجرت سے پہلے دارالارقم میں کھولا، اور پھر ہجرت کے بعد مدینہ میں مسجد نبویؐ میں قائم کیا، غزوۂ بدر میں قریش کے جو افراد گرفتار کیے گئے، ان کا زرِ فدیہ تعلیم مقرر ہوا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں، عہد نبویؐ کے بعد خلفاء اور مسلم سلاطین وامراء نے اس روش کو باقی رکھا، جگہ جگہ مساجد کے ساتھ ساتھ مدارس قائم کیے، لہٰذا نماز سے فراغت کے بعد مسجدیں مدرسوں میں تبدیل ہوجاتیں، اسلام کی اولین دانش گاہوں میں جامع قزوین، جامع عمروؓ بن العاص، جامع زیتونہ ہیں، اس کے بعد قاہرہ میں جامع ازہر اور اس کے بعد بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیے گئے، ان کے علاوہ اسلامی مملکت کے مختلف حصوں میں مسلم حکام اور اہل ثروت کی سرپرستی میں مدارس اور علمی وتعلیمی ادارے قائم تھے، جہاں تشنگان علم دور دراز کا سفر طے کرکے آتے اور کسب علم کرتے، اسلامی تاریخ میں سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ مسلم علماء نے کسب علم کے لیے کیسی کیسی مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کیں، مسلم حکام اور سلاطین نے علماء اور تشنگانِ علم کی ہمت افزائی کی، مسلمانوں نے ہر دور میں اور ہر جگہ کسب علم اور اشاعت علم کے میدان میں ایسے عظیم الشان کارنامے انجام دیے جن کی کسی اور قوم ومذہب میں مثال نہیں ملتی، میدانِ تعلیم وتعلم میں مسلم علماء کے صبر وتحمل، عرق ریزی، جفاکشی، جانفشانی اور قربانیوں کی مثالیں سیر وسوانح اور تاریخ علوم وفنون میں جابجا دیکھی جاسکتی ہیں، جن سے مسلمانوں کے علمی ذوق وشوق اور طلب علم کا اندازہ ہوتا ہے، یہ سب نبی امی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا فیض ونتیجہ ہے۔

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِ تعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT

A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)

IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157

State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT

Tagre Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Call : 9559844716

website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون	500/-	فی شمارہ	25/-	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔	$100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر ₹30/= جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار	شمس الحق ندوی	۵
ہٹ دھرمی کا انجام	حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی	۷
شکر گزار بندوں کی پہچان	مولانا عبد الرشید راجستھانی ندوی	۱۰
سوال و جواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۱۱
اسم پاک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	حضرت مولانا عبد الرحمٰن نگرامی ندویؒ	۱۳
سیرت نبویؐ کا عملی پیغام	مولانا سید محمد جعفر مسعود حسنی ندویؒ	۱۶
تذکرہ شاہ ولی اللہ	مولانا عتیق احمد بستوی	۱۸
رحمتِ عالمؐ کا ہمہ گیر فیضان	مولانا عبد السبحان ناخدا ندوی	۲۱
مولانا عبد الرزاق خان ملیح آبادیؒ	مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی	۲۳
انحصار سے خود مختاری کی طرف	مولانا محمد وثیق ندوی	۲۶
کیا عورت کو ناقص العقل کہنا تحقیر ہے؟	مولانا منور سلطان ندوی	۲۹
مطالعۂ سیرت کا صحیح منہج	مولانا محمد شاہد ناصری حنفی	۳۲
فکری انتشار کے اسباب اور سیرتِ نبویؐ	مولانا محمد عاشق صدیقی ندوی	۳۴
عصرِ حاضر کا بحران اور سیرت طیبہ کا پیغام	مولانا محمد سلمان بجنوری ندوی	۳۷
آئیے! معاشرہ کو پرسکون بنائیں	مولانا محمد زین الحق ندوی	۳۸
سیرت نبویؐ اور بچوں کی تربیت	مولانا محمد عظیم ندوی	۴۰
ماہِ ربیع الاول اور سیرتِ نبویؐ	مولانا عبد الحی حسنی ندوی	۴۲
پیکرِ اخلاق اور کامل دستورِ حیات	محمد جاوید اختر ندوی	۴۳
تعارف وتبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۴۵
امتیازاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	محمد نفیس خان ندوی	۴۷

اداریہ

تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار

شمس الحق ندوی

اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل بنایا ہے۔﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾(مائدہ:۳)(آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا)۔دین کی تمام بنیادی تعلیمات اور وہ اصول وضوابط جن کی رُو سے صحیح یا غلط کا فیصلہ کیا جا سکے، اور حلت وحرمت یا جواز وعدمِ جواز کی رائے قائم کی جا سکے؛ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں کھول کھول کر بیان فرما دی ہیں۔﴿وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا﴾(الإسراء:۱۲)(اور ہم نے ہر چیز کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے)، اور اپنے نبی علیہ الصلوۃ والتسلیم کے ذریعہ اس کی تشریح وتوضیح ہی نہیں کروائی؛ بلکہ اس کا عملی نمونہ بھی پیش کرا دیا ہے۔﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(الاحزاب:۲۱) یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔

کتاب وسنت کی تعلیمات اور ان میں بیان کیے گئے ضوابط وقواعد اور اصول کو سمجھنے کے بعد اب کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ کسی ایسی چیز کو دین میں داخل کیا جائے جو دین کے خمیر، اس کے مزاج اور اس کے منہج کے خلاف ہو؛ اب نہ کوئی اضافہ ہے نہ حذف، نہ کوئی تبدیلی ہے نہ تحریف۔

انہی تعلیمات واصول کو سامنے رکھ کر آج تک ہمارے اسلاف جنھیں ہم 'علمائے اہلِ سنت' بھی کہتے ہیں' دین کی تشریح وتوضیح کرتے آئے ہیں، انھوں نے ''من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد''(متفق علیہ)(جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کی جو اس میں سے نہیں ہے، تو وہ مردود ہے۔) کے اصول کے تحت کتاب وسنت کے مسلمہ امور اور ان سے ثابت شدہ اصل وقواعد سے ٹکرانے والی ہر نئی چیز اور بدعت سے امت کو خبردار کیا، اور اسلام کو ہر قسم کی ملاوٹ وآمیزش سے بتوفیق اللہ وفضلہ محفوظ رکھا ہے۔

یہ محض اتفاق نہیں کہ اسلام کو ایسے افراد میسر آ گئے؛ بلکہ اس کی پیشین گوئی لسانِ نبوت سے پہلے ہی کرا دی گئی، ارشاد فرمایا: ''إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مئة من يجدد لها دينها''(ابوداؤد:۴۲۹۱)(بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر سو سال کے سرے پر ایسے شخص کو مبعوث فرمائے گا جو اس کے لیے اس کے دین کی تجدید کرے گا۔) کہ دین کو آمیزشوں سے پاک کر کے اس کی روح کو تازگی بخشنے والے آتے رہیں گے، اور کوئی یہ خام خیالی نہ رکھے کہ حق کی تعلیمات پچھلوں کی طرح صفحۂ ہستی سے محو ہو جائیں گی، یا اس کے متبعین ناپید ہو جائیں گے۔ ''لا يزال من أمتي أمة قائمة بأمر الله، لا يضرهم من خذلهم، ولا من خالفهم، حتى يأتي أمر الله وهم على ذلك''(مسلم:۱۰۳۷)(میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی۔ جو لوگ انہیں چھوڑ دیں گے یا ان کی مخالفت کریں گے، وہ انہیں نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے گا اور وہ اسی حالت پر قائم ہوں گے۔)، اور اس امت کا دین اپنی درست حالت میں رہے گا۔ ''لن يزال أمر هذه الأمة مستقيماً حتى تقوم الساعة''(بخاری:۷۳۱۲)(اور اس امت کا معاملہ ہمیشہ درست رہے گا، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے، یا اللہ کا حکم آ جائے)۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہ دین ایک ہزارہ ونصف گذر جانے کے بعد بھی اپنے عقائد وتصورات، افکار ونظریات اور احکام وتعلیمات میں ویسا ہی باقی ہے جیسا کہ قرنِ اول میں تھا۔

ذرا دیگر ادیانِ سماوی کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں؛ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔اس کی کسوٹی پر آج ان کے پیروکاروں اور ان کے مذہبی لٹریچر میں ان کے عقائد وشرائع کو پرکھیں تو 'شتان ما بينهما'۔کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ان کے برعکس اسلام آج

بھی، کتابوں اور خیالوں میں ہی سہی، اور کل میں نہیں تو بعض افراد میں ہی سہی، اپنی حقیقی اور قدیم تصویر رکھتا ہے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ اس کے لٹریچر یا دینی مصادر جوں کے توں موجود ہیں، اور ہر طرح کی تحریف وتبدیلی سے پاک.........، جو ہمیشہ حقیقی اسلام کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اور ان شاء اللہ تا قیامت کرتے رہیں گے۔

قرآن کریم میں ﴿إِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (حجر:۹) (بے شک ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے، اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) دراصل دینِ حنیف کی حفاظت کا وعدہ ہے؛ 'ذکر' کا لفظ اس کی طرف واضح اشارہ کررہا ہے، ورنہ اگر 'قرآن' یا 'کتاب' کا لفظ ہوتا تو بات 'مکتوب' یا 'مقروء' یعنی صرف حروف ونقوش تک رہ جاتی، جب کہ تاریخ گواہ ہے کہ سابقہ کتابوں کے بہت سے نصوص وعبارتیں ہنوز اپنی اصل پر باقی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ان کا وہ معنی ومفہوم باقی نہ رہ سکا جو 'مُنزِل الکتاب' یا رسولِ خدا کی مراد تھا، آخر ''لاتصدقوا أهل الكتاب و لاتكذبوهم'' (اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو) کہنے کی نوبت ہی کیوں آئی ؟! لہٰذا قرآن کے صرف حروف ونقوش کی حفاظت کوئی معنویت نہیں رکھتی، جب تک 'ذکر' یعنی اس کے حقیقی پیغام وتعلیمات کی حفاظت کا وعدہ نہ ہو۔

المیہ یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ کا ایک بڑا حصہ قرآن کی تعلیمات اور قواعد واصولِ شرع اور اسوۂ رسولؐ کے واضح ہونے کے باوجود افراط وتفریط یا پھر مبالغہ وغلو کا شکار ہے، اور ایک جمِ غفیر ہے جو دین کے خودساختہ ترجمانوں کو پیچ حیص بیص کا شکار ہے۔ جدید وسائلِ نشر واشاعت اور ذرائعِ ابلاغ و اعلام نے ان کو اپنے مقاصد کے حصول میں بڑی آسانیاں فراہم کردی ہیں، اور ایک تیز وتند طوفان ہے جس میں عام افرادِ امت کا ذہن بہا جارہا ہے۔ اس طوفانِ بلاخیز میں حق کی رائے اور اعتدال کی فکر، گرچہ بتقاضائے فرمانِ نبوت موجود تو ہے؛ لیکن کہاں ہے، اور کیا ہے؟ عام لوگوں کی رسائی سے دور ہے۔ الا ما شاء اللہ۔

تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ آخر کمی کس بات کی ہے؟ تو جواب بھی فوراً ہی ذہن میں آتا ہے کہ کمی کردار کی اور عملی نمونہ کی ہے؛ حق کے ترجمانوں کی سیرت وحیات میں وہ قول وعمل کی مطابقت نہیں رہی، جس کی روشنی اور خوشبو ایک قوتِ جاذبیت بن کر بے طلبوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ تقوی وپرہیزگاری، سنت وشریعت پر عمل، خلوص واخلاص، انسانیت واخلاق، جو اسوۂ حسنہ کے تاج میں درخشاں نگینے اور اس کے لباس وپیرہن کے رنگ و خوشبو تھے، آخر ان کی چمک دمک اور خوشبو ایسی ماند پڑ گئی کہ حق کے متلاشیوں کی نگاہیں اور ان کے حواس اس کا ادراک نہیں کرپا رہے۔

یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے حق کے داعیوں اور ترجمانوں کے لیے، کہ اپنی شخصیت میں اسوۂ حسنہ کی جاذبیت اور کشش پیدا کریں، ورنہ اسلام کی حقیقی تصویر عالم کے اس خانہ خراب میں غرض ومادیت کی گرد میں لپٹی ہوئی اپنے حسن وجمال کے اظہار سے عاجز رہے گی، اور باطل کی بے نوری وتعفن کے سمندر میں انسانیت جو آخری درجہ کی بے چینی واضطراب کا شکار ہے، کسی ماہئ بے آب کی طرح اس کی تلاش میں سرگرداں رہے گی؛ لیکن بے سود......

علامہ اسی صورتحال کی کیا خوب منظرکشی کرگئے:

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ غزالی نہ رہے
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی، وہ گلستاں بہ کنار

☆☆☆

تعلیم القرآن

ہٹ دھرمی کا انجام

حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عظِيمٌ﴾ (البقرة:۷)

(اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی نگاہوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔)

جن لوگوں نے اپنے لیے یہ طے کرلیا ہے کہ وہ بات نہیں مانیں گے، ان کا انجام کار بتاتے ہوئے فرمایا گیا کہ اللہ نے ان کے لیے محرومی لکھ دی ہے لیکن اللہ نے یہ محرومی پہلے مرحلہ پر نہیں لکھی، اس کے یہاں عدل ہے، اس کا نظام یہ ہے کہ جو آنا چاہے وہ آجائے، ارشاد ہے:

﴿فَمَن شَاء فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْيَكْفُرْ﴾ (الکھف: ۲۹) (تو جو چاہے مانے اور جو چاہے انکار کرے۔)

تمام راستے بالکل واضح ہیں، خیر کا راستہ، ایمان کا راستہ، شر کا راستہ اور کفر کا راستہ۔ اب جو چاہے ایمان کا راستہ اختیار کرے اور جو چاہے کفر کا راستہ اختیار کرے۔ اللہ کے یہاں پہلے مرحلہ میں ہی مہر نہیں لگائی گئی۔ اس کے علم میں تو سب کچھ ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا نظام رکھا ہے کہ جو خود ہٹ دھرمی اختیار کرے گا' اللہ اس کے لیے محرومی لکھے گا، اس کا تذکرہ دیگر آیات میں بھی ہے، وہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر وہ یہ طے کرلیتے ہیں کہ ہمیں نہیں ماننا ہے تو اللہ کو کوئی پرواہ نہیں پھر اللہ بھی ان کے دلوں پر زنگ لگا دیتا ہے، ارشاد ہے:

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (المطففین: ۱۴)

(ہرگز نہیں! بات یہ ہے کہ ان کے کرتوتوں کی بنا پر ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے۔)

ایسا بالکل نہیں ہے کہ اللہ نے کسی کے متعلق یہ طے کرلیا کہ یہ ہمیشہ کافر رہیں گے اور کفر پر ہی مریں گے بلکہ اس نے سب کو دنیا میں اختیار دیا کہ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے لیکن وہ لوگ جنھوں نے ہٹ دھرمی اختیار کرلی ہے اور ان کے دل زنگ آلود ہوچکے ہیں، ان کے لیے یہی فیصلہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے اور وہ مہر بند ہوگئے، یہ بات وہ لوگ خود بھی کہتے تھے کہ:

﴿قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَل لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ (البقرة: ۸۸) (ہمارے دل مہر بند ہیں، بات یہ ہے کہ ان کے انکار کی وجہ سے اللہ نے ان کو دھتکار دیا ہے۔)

معلوم ہوا ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر ایسی مہر لگادی ہے کہ اب خیر کی کوئی چیز ان کے اندر داخل نہیں ہوگی۔ پتہ یہ چلا کہ پہلے مرحلہ میں خود آدمی کی اپنی ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہوتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ اللہ نے طے کردیا کہ اب یہ کافر ہوں گے اور یہ مومن ہوں گے، اس میں شبہ نہیں کہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ عمل پر دیتا ہے اور اندر کے جذبات وخیالات کی بنا پر اللہ کے یہاں سے ملتا ہے، حدیث میں آتا ہے:

"إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَخْطَأَ خَطِيئَةً نُكِتَتْ فِي قَلْبِهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ، فَإِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَتَابَ صُقِلَ قَلْبُهُ، وَإِنْ عَادَ زِيدَ فِيهَا حَتَّى تَعْلُوَ قَلْبَهُ۔" (سنن الترمذی: ۳۳۳۴)

(بلاشبہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے پھر اگر وہ گناہ چھوڑ دے، توبہ واستغفار کرلے تو اس کا دل صاف کردیا جاتا ہے اور اگر دوبارہ گناہ کرے تو وہ سیاہی بڑھا دی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے۔)

حاصل یہ کہ جن لوگوں کے بارے میں یہ طے ہوگیا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اور ان کے دل مہر بند ہوگئے، انھوں نے جاننے کے باوجود، ہٹ دھرمی اور عناد کی بنا پر پہلے مرحلہ میں اپنے عمل سے خود یہ طے کرلیا ہے کہ ہم کو ایمان نہیں لانا ہے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے نبی ہیں، ان کی کتاب تورات میں آخری نبی کی جو نشانیاں بیان کی گئی تھیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وہ پوری طرح منطبق ہوتی تھیں اور وہ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے لیکن اس کے باوجود کہتے تھے کہ ہم نہیں مانیں گے۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آکر باتیں کرتے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے کہ تم مانتے کیوں نہیں ہو؟ تو جواب دیتے تھے کہ یہ ممکن نہیں۔ سنن ترمذی کی یہ روایت ملاحظہ ہو:

"عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ أَنَّ يَهُودِيَّيْنِ قَالَ

أَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهِ: اذْهَبْ بِنَا إِلَى هَذَا النَّبِيِّ نَسْأَلُهُ، فَقَالَ: لَا تَقُلْ نَبِيًّا، فَإِنَّهُ إِنْ سَمِعَهَا تَقُولُ: نَبِيٌّ، كَانَتْ لَهُ أَرْبَعُ أَعْيُنٍ۔ فَأَتَيْنَا النَّبِيَّ ﷺ فَسَأَلَاهُ عَنْ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ: {وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ} فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ شَيْئًا، وَلَا تَزْنُوا، وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، وَلَا تَسْرِقُوا، وَلَا تَسْحَرُوا، وَلَا تَمْشُوا بِبَرِيءٍ إِلَى سُلْطَانٍ فَيَقْتُلَهُ، وَلَا تَأْكُلُوا الرِّبَا، وَلَا تَقْذِفُوا مُحْصَنَةً، وَلَا تَفِرُّوا مِنَ الزَّحْفِ، وَعَلَيْكُمْ يَا مَعْشَرَ الْيَهُودِ خَاصَّةً أَلَّا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ۔ فَقَبَّلَا يَدَيْهِ وَرِجْلَيْهِ، وَقَالَا: نَشْهَدُ أَنَّكَ نَبِيٌّ۔ قَالَ: فَمَا يَمْنَعُكُمَا أَنْ تُسْلِمَا؟ قَالَا: إِنَّ دَاوُدَ دَعَا اللّٰهَ أَنْ لَا يَزَالَ فِي ذُرِّيَّتِهِ نَبِيٌّ وَإِنَّا نَخَافُ إِنْ أَسْلَمْنَا أَنْ تَقْتُلَنَا الْيَهُودُ۔“

(سنن الترمذی: ۳۱۴۴)

(حضرت صفوان بن عسالؓ سے روایت ہے کہ دو یہودیوں میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: چلو اس نبی کے پاس چلیں اور ان سے سوال کریں، دوسرے نے کہا: انہیں نبی مت کہو، اگر وہ تمہیں نبی کہتے ہوئے سن لیں گے تو ان کی آنکھیں چار ہو جائیں گی (یعنی وہ بہت خوش ہوں گے) پھر وہ دونوں نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں پوچھا: ”اور یقینا ہم نے موسیٰ کو نو کھلی نشانیاں دی تھیں“؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، زنا نہ کرو، ناحق کسی جان کو قتل نہ کرو، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، کسی بے گناہ کو حاکم کے پاس اس لیے نہ لے جاؤ کہ وہ اسے قتل کر دے، سود نہ کھاؤ، پاک دامن عورت پر تہمت نہ لگاؤ، میدان جنگ سے فرار نہ ہو اور اے یہودیو! خاص طور پر تم پر لازم ہے کہ ہفتہ کے دن کی حد سے تجاوز نہ کرو۔ یہ سن کر ان دونوں نے آپ ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں چوم لیے اور کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تمہیں اسلام قبول کرنے سے کیا چیز روکتی ہے؟ وہ بولے: حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تھی کہ ان کی نسل میں ہمیشہ ایک نبی رہے اور ہمیں خوف ہے کہ اگر ہم اسلام لے آئیں تو یہودی ہمیں قتل کر دیں گے)۔

ہٹ دھرمی،، سازشی ذہن اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنا شروع سے یہودیوں کا مزاج رہا ہے، قرآن مجید میں بھی ان کا یہ دعویٰ بیان کیا گیا ہے کہ:

﴿نَحْنُ أَبْنَاءُ اللّٰهِ وَأَحِبَّاؤُهُ﴾ (المائدة: ۱۸) (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں)۔

گویا وہ اپنے لیے وہاں سے جاگیر لکھوا کر لائے ہوں، اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات بھی ارشاد فرمائی:

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم﴾ (المائدة: ۱۸) (آپ پوچھئے کہ پھر وہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟)

معلوم ہوا کہ ان چیزوں کا تعلق اعمال سے ہے، اندر کے جذبات اور عقیدہ سے ہے، اگر وہ صحیح راستہ پر ہیں تو بہتر ہے اور اگر اندر سے ہٹ دھرمی ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں محرومی ہے۔

آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ نے دلوں کے ساتھ ان کے کانوں پر بھی ایسی مہر لگا دی ہے کہ اب ان کو کچھ سنائی بھی نہیں پڑتا، لگتا ہے کہ وہ بہرے ہو گئے ہیں اور ان کے کانوں میں کوئی بات جاتی ہی نہیں۔ اسی طرح فرمایا کہ ان کی نگاہوں پر بھی ایسا پردہ ہے کہ وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔

پہلے مرحلہ میں یہ تھا کہ ان کے دل بند تھے، اب اگر کان کھلے ہوتے اور کوئی بات چلی جاتی تو شاید سوچنے پر مجبور ہو جاتے لیکن اب تو مسئلہ یہ ہے کہ وہ کچھ سننے کو تیار نہیں، گویا انھوں نے اپنے کانوں کو بھی بند کر لیا تھا، سیرت میں اس کے واقعات بھی ملتے ہیں کہ جب آپ ﷺ تلاوت کرتے تھے تو کانوں میں لوگ انگلیاں دے لیتے تھے، یا کانوں میں روئی ٹھونس لیتے تھے تاکہ غلطی سے بھی آواز نہ پڑ جائے اور اس کا اثر نہ ہو جائے، ظاہر ہے اس سے بڑھ کر محرومی کیا ہو گی؟! اسی لیے فرمایا گیا کہ وہ لوگ بالکل ایسے اندھے بن گئے کہ کوئی بھی چیز دیکھنا ہی نہیں چاہتے، آنحضرت ﷺ کی مبارک زندگی، آپ ﷺ کے اخلاق کی بلندی؛ اگر وہ دیکھتے تو یہ ساری چیزیں ان کی نگاہوں کے سامنے تھیں لیکن انھوں نے دیکھنا ہی گوارا نہ کیا اور جن لوگوں نے دیکھنا پسند کیا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں، انھوں نے اپنے کان کھولے تو اللہ نے ان کے دل بھی کھول دیے اور اللہ نے انہیں ایمان کی دولت عطا فرما دی، نہ جانے کیسے کیسے سرکش قسم کے لوگ تھے لیکن جب انھوں نے اپنے کان کھولے اور کانوں میں بات پہنچی، جب آنکھیں کھولیں اور اللہ کے نبی ﷺ کی مبارک زندگی دیکھی تو اللہ نے انہیں توفیق دی اور ان کے دل کھول دیے لیکن جن لوگوں نے طے کر لیا تو ان کے دل مہر بند ہو گئے، سیسہ گویا ان کے کانوں میں پلا دیا گیا،

ان کا حال یہ ہے کہ آنکھیں بھی پتھرا گئیں اوران کے سامنے پردے پڑ گئے، اس کے بعد ان کے ایمان لانے کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی، اسی لیے آپ ﷺ سے یہ بات کہی گئی کہ آپ ان سے بالکل امید نہ رکھیں، آپ ان کو سمجھایئے ڈرایئے سب کچھ کیجیے لیکن اگر ان کو ایمان نہیں لانا ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

لوگوں میں ایک طبقہ ایسا ہے جس کا حال یہ ہے کہ اس نے ایمان نہ لانے کی ٹھان لی ہے اور ہمیں بھی اس کا مکلف نہیں کیا گیا ہے کہ ہر شخص ایمان لے آئے، ہمیں اس بات کا مکلف کیا گیا ہے کہ ہم اپنی بات پہنچائیں، ارشادِ الٰہی ہے:

{إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ} (الشوری: ۴۸) (آپ کا کام تو صرف پہنچا دینا ہے۔)

ہدایت دینا اللہ کا کام ہے، اگر اللہ کا فیصلہ ہے تو وہ عطا فرمائے گا ورنہ نہیں اور اللہ کا فیصلہ یوں ہی نہیں ہوتا بلکہ آدمی کی طلب یا ہٹ دھرمی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اس دور میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے دلوں پر مہر لگی ہے اور ان کے لیے محرومی لکھ دی گئی ہے اور وہ لوگ کون ہیں جن تک اگر بات پہنچائی جائے تو وہ بات کو مان سکتے ہیں؟ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم بات پہنچا دیں جیسا کہ آپ ﷺ سے کہا گیا، اب آپ کی امت کی بھی یہی ذمہ داری ہے کہ وہ بات پہنچا دے لیکن ایمان وہی لائے گا جس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ ہے اور اس کے دل کھلے ہوئے ہیں، اس کے برعکس جن لوگوں کے دل کھلے ہوئے نہیں ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

☆☆☆

فخرِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

''دنیا کے ہر انسان کو فخر کرنا چاہیے کہ ہماری نوعِ انساں میں ایک ایسا انسان پیدا ہوا جس سے انسانیت کا سر اونچا اور نام روشن ہوا، اگر آپ (ﷺ) نہ آتے تو دنیا کا نقشہ کیا ہوتا، اور ہم انسانیت کی شرافت وعظمت کے لیے کس کو پیش کرتے؟ محمد رسول اللہ (ﷺ) ہر انسان کے ہیں، محمد رسول اللہ (ﷺ) سے اس دنیا کی رونق اور نوعِ انسانی کی عظمت ہے،، وہ کسی قوم کی ملک نہیں، ان پر کسی ملک کا اجارہ نہیں؛ وہ پوری انسانیت کا سرمایۂ فخر ہیں، کیوں آج کسی ملک کا انسان فخر ومسرت کے ساتھ یہ نہیں کہتا کہ میرا اس نوع سے تعلق ہے جس میں محمد رسول اللہ (ﷺ) جیسا انسانِ کامل پیدا ہوا۔

آج انسانوں کا کون سا طبقہ ہے جس پر آپ کا براہ راست یا بالواسطہ احسان نہیں؟ کیا مردوں پر آپ (ﷺ) کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کو مردانگی اور آدمیت کی تعلیم دی؟ کیا عورتوں پر آپ (ﷺ) کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کے حقوق بتلائے، ان کے لیے ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں؟ کیا کمزوروں پر آپ (ﷺ) کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کی حمایت کی اور فرمایا کہ مظلوم کی بددعا سے ڈرو کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں؟ کیا طاقتوروں اور حکمرانوں پر آپ (ﷺ) کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کو ان کے حقوق وفرائض بتلائے اور انصاف کرنے والوں اور خدا سے ڈرنے والوں کو بشارت سنائی؟ کیا تاجروں پر آپ (ﷺ) کا احسان نہیں کہ آپ نے تجارت کر کے اس گروہ کی عزت بڑھائی؟ کیا آپ (ﷺ) کا مزدوروں پر احسان نہیں کہ آپ نے تاکید فرمائی کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو؟ کیا جانوروں تک پر آپ (ﷺ) کا احسان نہیں کہ آپ نے فرمایا ہر وہ مخلوق جس میں احساس وزندگی ہے اس کو آرام پہنچانا اور کھلانا پلانا بھی صدقہ ہے؟ کیا ساری انسانی برادری پر آپ کا احسان نہیں کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپ شہادت دیتے تھے کہ خدایا تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں؟ کیا ساری دنیا پر آپ (ﷺ) کا احسان نہیں کہ سب سے پہلے دنیا نے آپ ہی کی زبانی سنا کہ خدا کسی ملک، قوم، نسل وبرادری کا نہیں سارے جہانوں اور سب انسانوں کا ہے؟

ہماری آپ کی دنیا میں حکماء وفلاسفہ بھی آئے، ادباء وشعراء بھی، فاتح وکشور کشا بھی، سیاسی قائد اور قومی رہنما بھی، موجدین ومکتشفین (سائنٹسٹ) بھی، مگر کس کے آنے سے دنیا میں وہ بہار آئی جو پیغمبروں کے آنے سے، پھر سب سے آخر سب سے بڑے پیغمبر محمد رسول اللہ (ﷺ) کے آنے سے آئی؟! کون اپنے ساتھ وہ شادابی، وہ برکتیں، وہ رحمتیں نوعِ انسانی کے لیے وہ دولتیں، اور انسانیت کے لیے وہ نعمتیں لے کر آیا جو محمد رسول اللہ (ﷺ) لے کر آئے، تیرہ سو برس کی انسانی تاریخ پورے وثوق کے ساتھ آپ (ﷺ) کو خطاب کر کے کہتی ہے:

سرسبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو ٹھہرے تو جس شجر کے تلے نہال ہو''

(کاروان مدینہ: ۷۶-۷۷)

تعلیم الحدیث

شکر گزار بندوں کی پہچان

مولانا عبد الرشید راجستھانی ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، قَالَ: مُطِرَ النَّاسُ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: »أَصْبَحَ مِنَ النَّاسِ شَاكِرٌ، وَمِنْهُمْ كَافِرٌ، قَالُوا: هَذِهِ رَحْمَةُ اللّٰهِ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَقَدْ صَدَقَ نَوْءُ كَذَا وَكَذَا«. قَالَ: فَنَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ: ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ﴾ حَتَّى بَلَغَ: ﴿وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ﴾ (مسلم: ۷۳)

ترجمہ: حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بارش ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں میں سے بعض نے صبح شکر گزار ہو کر کی اور بعض نے ناشکرے ہو کر۔ کچھ لوگوں نے کہا: یہ اللہ کی رحمت ہے، اور بعض نے کہا: فلاں ستارہ سچا ثابت ہوا۔'' اس پر یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ﴾ سے لے کر ﴿وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ﴾ تک۔

تشریح: اللہ تعالیٰ ہی تمام نعمتوں کو عطا کرنے والا ہے۔ رزق، صحت، اولاد، علم، عزت، بارش اور زندگی کی ہر نعمت اسی کے فضل سے ملتی ہے۔ مگر ان نعمتوں کے بارے میں بندوں کا طرزِ فکر ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ایک جماعت ہر نعمت کے پیچھے منعمِ حقیقی کو پہچانتی ہے، اس لیے اس کا دل اللہ کی عظمت اور اس کے احسان کے احساس سے بھر جاتا ہے، اس کی زبان اس کے شکر اور حمد سے تر رہتی ہے۔ دوسری جماعت کی نگاہ صرف ظاہری علامات اور اسباب تک محدود رہتی ہے۔ وہ نعمت تو دیکھتی ہے، مگر نعمت دینے والے کو بھول جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارش کی مثال سے اسی حقیقت کو واضح فرمایا۔ جنہوں نے کہا: ''یہ اللہ کی رحمت ہے''، وہ شکر گزار قرار پائے، اور جنہوں نے جاہلانہ عادت کے مطابق بارش کو ستاروں کی طرف منسوب کیا، وہ ناشکری کے مرتکب ہوئے۔

اسلام اسباب کے اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے، لیکن یہ بھی سکھاتا ہے کہ اسباب سے دل وابستہ نہ ہو، وہ بذاتِ خود مؤثر نہیں ہوتے۔ بیج اگاتا نہیں، بلکہ اللہ اگاتا ہے، دوا شفا نہیں دیتی، بلکہ اللہ شفا دیتا ہے، محنت کامیابی کی ضمانت نہیں، بلکہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ملتی ہے۔ اس لیے مومن اسباب اختیار کرتا ہے، مگر بھروسا صرف اپنے رب پر رکھتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اسی حقیقت کو انبیائے کرام علیہم السلام کی زندگیوں سے نمایاں کیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے عظیم سلطنت اور غیر معمولی اقتدار حاصل ہونے پر فرمایا: ﴿هَٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ﴾۔ ''یہ میرے رب کا فضل ہے، تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ جو شکر کرتا ہے، وہ اپنے ہی فائدے کے لیے شکر کرتا ہے، اور جو ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز، بڑا کرم فرمانے والا ہے۔'' حضرت یوسف علیہ السلام کو حکومت ملی، تمام آزمائشوں سے گزر کر سرخ رو ہوئے تو عرض کیا: ﴿رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ﴾۔ ''اے میرے رب! تو نے مجھے حکومت میں سے حصہ عطا فرمایا اور مجھے باتوں کے انجام (خوابوں کی تعبیر) کا علم سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے۔ مجھے اسلام پر قائم رکھتے ہوئے وفات دینا اور مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما دینا۔'' ان حضرات نے اپنی نعمتوں کو اپنے کمال کا نہیں، بلکہ اپنے رب کے فضل کا نتیجہ قرار دیا۔

اس کے برعکس قارون نے کہا: ﴿إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي﴾ یعنی یہ سب مجھے میرے استحقاق اور جانکاری کی بنا پر ملا ہے۔ یہی ناشکری کی جڑ ہے کہ انسان نعمت کو اللہ تعالیٰ کے بجائے اپنی صلاحیت کا ثمرہ سمجھنے لگے۔ دل اسباب سے معلّق ہو جائے، زبان پر اسی کی رٹ ہو۔

قرآنِ مجید نے فرمایا: ﴿وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾، یعنی میرے بندوں میں شکر گزار بہت کم ہیں۔ نعمتوں سے فائدہ اٹھانے والے تو سب ہیں، لیکن نعمت دینے والے کو یاد رکھنے والے اور اس کے حق کو پہچاننے والے کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی شکر ایک عظیم عبادت اور بلند مقام ہے۔

فائدہ: یہ حدیث ہر مومن کو اپنا جائزہ لینے کی دعوت دیتی ہے۔ جب کوئی کامیابی ملے، کوئی نعمت حاصل ہو یا کوئی مصیبت ٹل جائے تو سب سے پہلے دل اور زبان پر اپنے رب کا اعتراف ہونا چاہیے۔ جو بندہ ہر نعمت میں اللہ تعالیٰ کا فضل دیکھتا ہے، اس کے اندر عاجزی پیدا ہوتی ہے، تکبر ختم ہوتا ہے، ایمان مضبوط ہوتا ہے اور اس کی زندگی شکر و معرفتِ الٰہی سے معمور ہو جاتی ہے۔ یہی اس حدیث کا اصل پیغام ہے۔

☆☆☆

تعلیم الفقہ

سوال و جواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

سوال: آج کل نوجوانوں میں بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے، سوال یہ ہے کہ بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول سرڈھک کر نماز پڑھنے کا تھا، علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ''مواب'' نامی عمامہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ٹوپی کے اوپر پہنتے اور کبھی صرف ٹوپی پہنتے، عمامہ نہیں۔

[زادالمعاد: ج۱/ص۱۳۵]

اس لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ ٹوپی یا عمامہ موجود ہو اس کے باوجود صرف سستی اور کاہلی کی وجہ سے بغیر ٹوپی و عمامہ کے نماز پڑھی جائے تو یہ مکروہ ہے۔

[فتاوی ہندیہ: ج۱/ص۱۰۶]

مشہور عالم دین مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ لکھتے ہیں: صحیح مسنون طریقہ نماز کا وہی ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بالدوام ثابت ہوا ہے یعنی بدن پر کپڑے اور سر ڈھکا ہوا ہو، پگڑی سے یا ٹوپی سے۔

[فتاوی ثنائیہ: ج۱/ص۵۲۵]

البتہ اگر ٹوپی یا عمامہ ہی کسی کے پاس نہ ہو تو اسکی وجہ سے نماز نہ چھوڑے بلکہ بغیر ٹوپی کے نماز ادا کرلے، اس سے بھی نماز ہوجائے گی؛ لیکن اس کو معمول بنانا کراہت سے خالی نہیں۔

سوال: مساجد میں ایسا دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ اِن شرٹ کر کے بھی نماز پڑھتے ہیں کیا اس طرح نماز ادا کرنا درست ہے؟

جواب: اِن شرٹ کرنے کی وجہ سے کمر کے نیچے کے حصہ میں اعضاء کی ساخت نمایاں ہوجاتی ہے اور ایک گونہ بے پردگی ہوتی ہے حالانکہ نماز کی حالت میں ستر اور پردہ کا خاص طور پر حکم ہے، اس لیے حالت نماز میں اس طرح کی بے ستری نامناسب ہے جس سے گریز کرنا چاہیے البتہ نماز ادا ہوجائے گی۔

[الدر المختار علی رد المحتار: ج۱/ص۹۱]

سوال: پینٹ یا پائجامہ ٹخنے سے نیچے لٹکتا ہو تو نماز درست ہوگی یا نہیں؟

جواب: ٹخنے سے نیچے لٹکتا ہوا کپڑا پہننا عام حالات میں بھی ممنوع ہے، حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تین شخص وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے بات نہیں کریں گے اور نہ اس کی طرف نگاہ رحمت فرمائیں گے اور نہ ہی ان کو گناہوں سے پاک کریں گے اور ان کے لیے سخت عذاب ہوگا، ان تینوں میں پہلا شخص وہ ہوگا جو اپنے کپڑے ٹخنوں سے نیچے لٹکا کر رکھے۔

[سنن ابوداؤد، حدیث/ ۴۰۸۸]

اس طرح کی حدیثوں کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے لکھا ہے کہ پائجامہ (یا پینٹ وغیرہ) ٹخنوں سے نیچے رکھنا ممنوع و مکروہ تحریمی ہے اور نماز کی حالت (جو ایک اہم عبادت ہے) میں ایسا کرنا مزید کراہت اور گناہ ہے البتہ نماز ہوجائے گی۔

سوال: ہاف شرٹ میں نماز ادا کرنا کیسا ہے، اسی طرح اگر فل شرٹ ہو؛ لیکن آستین نماز کی حالت میں کہنیوں سے اوپر اٹھا لینا کیسا ہے؟

جواب: آستین کو کہنیوں تک اٹھا کر نماز پڑھنا مکروہ اور خلاف ادب ہے، فقہاء نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ایسا کرنا مکروہ ہے: ''**ولو صلّی رافعاً کفیه الی المرفقین کره**'' اور وہ لوگ جو ہاف شرٹ پہننے کے عادی ہیں اور ہر جگہ ان کا وہی لباس ہے تو ان کے لیے ہاف شرٹ استعمال کرنے کی حالت میں بھی نماز ادا کرنے کی گنجائش ہے۔

[فتاوی ہندیہ: ج۱/ص۱۰۶]

سوال: بعض لوگوں کے لیے اپنے اسکول یا آفس میں ٹائی لگانا ضروری ہوتا ہے اور ڈیوٹی کے دوران نماز کا وقت آجاتا ہے کیا ایسے لوگ ٹائی پہنے ہوئے نماز پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: موجودہ دور میں ٹائی کا استعمال عمومی طور پر ہونے لگا ہے اور بظاہر کسی عقیدہ اور دینی نظریہ کی بنا پر لوگ استعمال نہیں کرتے ہیں اس لیے اگر نماز کی حالت میں ٹائی لگی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، نماز ادا ہوجائے گی۔

سوال: سینٹ لگے کپڑوں میں نماز درست ہوگی یا نہیں؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ الکحل ہے جو نجس ہے، اس لیے نماز نہیں ہوتی ہے، صحیح کیا ہے؟

جواب: سینٹ کے بارے میں ماہرین کیمیاء کی رائے یہ ہے کہ اس میں جو الکحل استعمال ہوتا ہے، وہ نشہ آور نہیں ہوتا ہے اور یہ اس سے مختلف ہوتا ہے جو شراب اور دواؤں میں استعمال کیا جاتا ہے، اس لیے یہ ناپاک نہیں ہے، لہٰذا ناپاک نہ ہونے کی وجہ سے کپڑا بھی ناپاک نہیں ہوگا اور اس کے لگے ہونے سے نماز درست ہوگی۔

سوال: قرض کی ادائیگی کے وقت قرض سے زیادہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ زیادتی

عقد میں مشروط نہ ہو بلکہ اتفاقاً قرض ادا کرتے وقت کچھ زیادہ دیدیا جائے؟

جواب: قرض ادا کرتے وقت کچھ زیادہ دیدیا جائے جبکہ زیادتی عقد میں مشروط ہو اور نہ اس کا رواج ہو کہ زیادتی کی امید کی جاتی ہو، تو ایسی صورت میں قرض سے زیادہ دینا درست ہے۔

[جامع ترمذی: ج۱/ص ۲۴۰]

سوال: آج کل لوگوں میں بلاضرورت قرض لینے کا کافی رواج ہوگیا ہے، کیا بغیر مجبوری بھی قرض لینا جائز ہے؟

جواب: احادیث نبویؐ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مقروض بننا کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے اور جب تک کوئی واقعی حاجت درپیش نہ ہو حتی الامکان اس سے بچنا چاہیے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقروض بننے سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

[صحیح بخاری: ۲۳۹۷]

سوال: قرض لینے کے بعد اسکی ادائیگی کی فکر نہ کرنا یا ادا کرنے کی پوزیشن ہو اس کے باوجود ٹال مٹول سے کام لینا شرعاً کیسا ہے؟

جواب: ضرورت کے وقت ادائیگی کی نیت سے قرض لینا جائز ہے، لیکن قرض لے کر اس سے غافل ہوجانا اور ادائیگی کی نیت نہ کرنا جائز نہیں، حدیث نبویؐ میں ہے کہ غفلت کے تین درجے ہیں: ان میں سے ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی قرض کی ادائیگی سے اس طرح غافل ہوجائے کہ وہ اس پر سوار ہوتا چلا جائے، اور اس کا خوف اس پر مسلط ہوجائے۔

[شرح مشکل الآثار للطحاوی: ۴۲۸۵]

دوسری حدیث میں ہے کہ: مالدار شخص کا قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ [ترمذی]

☆☆☆

مسائل زندگی میں اعتدال اور حکمتِ عملی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

حضورؐ اسلامی زندگی کے مسائل کے لیے حکمت کے پہلو کو اپناتے تھے، آپ نوجوں کی خود تربیت فرماتے تھے، اور جنگ کے سلسلہ میں بہتر سے بہتر تدبیروں کو اختیار کرتے تھے اور دشمن کے فریب سے بچنے میں ذرہ برابر کوتاہی ہیں کرتے تھے، آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا، آپؐ ہر کام کے لیے ساز وسامان اور حکمت وتدبیر کے ساتھ پوری تیاری کرتے تھے، آپؐ نے اپنے صحابہؓ سے جبل احد کی جانب سے دشمنوں سے جنگ کرنے یا پھر مدینہ میں رہ کر ان کا دفاع کرنے کے سلسلے میں مشورہ کیا، اور جب آپؐ نے دیکھا کہ صحابہ کی بڑی تعداد کی رائے شہر کی محفوظ فضا سے نکل کر شہر سے باہر میدان میں جنگ کرنے کی ہے، تو آپؐ نے ان کی رائے کو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے زیادہ مدبرانہ نہ سمجھتے ہوئے بھی مان لیا، پھر یہ بھی تدبیر کی کہ کچھ تیر انداز ساتھیوں کو میدان جنگ سے متصل پہاڑی پر بیٹھنے کا حکم فرمایا تاکہ وہ دشمن کی نقل وحرکت پر نظر رکھ سکیں اور جنگ کے خاتمہ تک ان کو وہاں جمے رہنے کی تاکید کی؛ لیکن وہ لوگ جنگ کا پانسہ دشمن کے خلاف ہوتے ہوئے دیکھ کر بعد میں اس خیال سے وہاں سے ہٹ گئے کہ مسلمان غالب آرہے ہیں، اور کفار شکست کھا رہے ہیں، چنانچہ مسلمانوں کو اس غلطی کی وجہ سے زبردست نقصان کا سامنا کرنا پڑا اور کچھ دیر کے لیے انہیں سخت ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا، اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن تدبیر اور جنگی مصلحت کو سمجھنے کا پتہ چلتا ہے، آپ توکل کرنے کی نصیحت تدبیر وحکمت اختیار کرتے ہوئے کرنے کا حکم فرماتے تھے، آپؐ فرماتے تھے کہ اونٹ کو باندھو پھر توکل کرو یعنی اونٹ کو باندھنے کی تدبیر نہ کرکے بھروسہ کرنا یہ ان شاء اللہ بھاگے گا نہیں، صحیح نہیں۔ حضورؐ نے ایران میں منجنیق (جو توپ کی طرح ہوتی تھی) بطور اسلحہ جنگ اختیار کیے جانے کو حضرت سلمان فارسیؓ سے سنا اور اختیار فرمایا، اسی طرح آپؐ نے بادشاہوں سے رابطہ کرنے میں اس دور میں رائج طریقوں کو اپنایا، چنانچہ آپؐ نے ان کے پاس خطوط روانہ کیے اور اس زمانہ کے مہذب ومثقف بادشاہوں کے رواج کے مطابق ان خطوط پر اپنی مہر لگائی، ساتھ ہی آپؐ نے لکھنے پڑھنے کو سیکھنے کا بھی حکم فرمایا بلکہ غیر عربی زبانوں کو بھی سیکھنے کا حکم دیا، آپ علم حاصل کرنے کا حکم فرماتے اور اس کی بہت تعریف کرتے تھے اور علوم کے جمع کرنے وترتیب دینے کا خاص اہتمام فرماتے تھے، آپ کا زہد وتوکل اس دور میں رائج وسائل کو اختیار کرنے میں حارج نہیں ہوا، آپ نے کھجور کی تلقیح کو دیکھا تو اس کو نہ کرنے کی بات فرمائی، اور اس سے لوگوں کو روک دیا، لیکن جب آپؐ کو علم ہوا کہ ترکِ تلقیح سے پھلوں کو نقصان ہو رہا ہے تو انہیں اجازت دیدی اور فرمایا کہ یہ تمہارے دنیاوی معاملات میں سے ہے یعنی عام تدبیروں سے اس کا تعلق ہے جسے انسان اپنے تجربہ اور فہم کی بنیاد پر اپناتا ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دین اس سے روکتا نہیں ہے بلکہ اس کو بہ نظر تحسین دیکھتا ہے اور جب تک کوئی بات دین سے متعارض نہ ہو اس کی تحسین وستائش کرتا رہتا ہے۔

☆☆

قندمکرر

اسم پاک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت مولانا عبدالرحمن نگرامی ندویؒ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی آپ کے داد عبدالمطلب نے رکھا تھا، عام طور پر اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ رجاء أن یُحمد۔عبدالمطلب نے آثار نیک دیکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نام رکھا کہ مستقبل میں یہ مولودِ سعید آقائے نام دار مجموعۂ محامد اور مرجعِ خلائق بنے۔اربابِ تصوف موشگافی کی انتہا کردیتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ یہ لفظ ''محمدؐ'' خدا کے نام ''احد'' سے مشتق ہے۔

اگرچہ عام طور پر نام کی صرف اس قدر ضرورت سمجھی جاتی ہے کہ چند چیزوں میں باہم امتیاز قائم رہے، لیکن نام کی صحیح اور حقیقی غرض یہ نہیں۔ اسم کو اپنے مسمّٰی کے صفات خواص اور حالات کا آئینہ ہونا چاہیے۔افراد کے نام رکھنے میں تو اس کا کم لحاظ کیا جاتا ہے، لیکن عموماً انواع واجناس کے نام اسی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔مثلاً انسان، مسلم، قوم شاذونادر طریقہ پر افراد و اشخاص کے ناموں میں بھی اس کا لحاظ کرلیا جاتا ہے جیسے ''مسیح'' اور ''بدھ'' یہ دونوں نام اپنے مسمّٰی کے اوصاف اور خواص کو بتلاتے ہیں۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں کہیں اس نام کا پتہ نہیں چلتا۔مؤرخین اکثر لکھتے ہیں: ''**ولم یکن شائعاً بین العرب هذا الاسم**'' اس حالت کو تسلیم کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اتفاقی طور سے ''نام مبارک'' کا ''عبد المطلب'' کے ذہن میں آنا منشاء خداوندی معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نام کا محل کامل دنیا کو اپنے وجودِ گرامی سے مشرّف کرچکا تو پھر اسم بھی فطری طور سے نام رکھنے والے کے ذہن میں وارد ہوا۔

نام مبارک کا عام اور سادہ ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ ''وہ ذات جس کی تعریف کی گئی'' اس ترجمہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اس جامعیت کبریٰ، برزخ کامل اور مقصود آفرینش کے فضائل وکمالات کے سامنے ترجمہ ہیچ ہے، خدا کے تمام نبی اُس کے نزدیک موجب توصیف ہیں۔ دنیا کے تمام حکیم، فاتح عام انسانوں کی نظروں میں لائق مدح وستائش ہیں، اس لیے اس ترجمہ کی صحت کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے تفحص کو اور زیادہ وسعت دیں، صاحبِ مفردات ''محمدؐ'' کے معنی لکھتے ہیں: ''**الذي أجمعت فيه الخصال المحمودة**'' یعنی مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی مجموعۂ خوبی کے ہیں ؎

اے کہ تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

کارسازِ قدرت کی وسعت لامحدود، اس کے کرشمے ناقابلِ شمار، اس کی خلقت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے وا ہے۔غور کرنے سے ہم اپنی عقل کے مطابق اس فیصلہ پر پہنچتے ہیں کہ قدرت نے تخلیقِ انواع کے لیے ایک معیار مقرر کیا ہے۔مخلوقات کی ہر نوع کا ایک درجۂ کمال ہے کہ جس کے آگے اُس کا قدم نہیں بڑھتا، 'حیوانات'، 'نباتات' اور 'جمادات' تک میں اس کے شواہد مل سکتے ہیں، صورتیں ایک ہیں شکلیں متحد ہیں، اوصاف مختلف ہیں لیکن ان مختلف اوصاف کی ایک انتہا ہے جسے جنس اعلیٰ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ جس کے آگے کوئی درجہ نہیں۔ ہر نوع میں جنس اعلیٰ کو جس پر اوصاف جامعیت کے ساتھ جاکر ختم ہوتے ہیں، ہم مقصود فطرت اور نقطۂ تخلیق کہہ سکتے ہیں.....اس نقطۂ تخلیق کی اصطلاح کو پوری تشریح کے ساتھ ذہن میں رکھنا چاہیے۔یہ بات تھوڑے غوروفکر سے بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے، تفحص اور تفتیش کے بعد تمام انواع مخلوقات کے اوصاف کا ایک درجۂ اعلیٰ پاتے ہیں کہ جس کے آگے انسانی معلومات میں کوئی درجہ نہیں۔

دوسرے تمام انواع کی طرح اس مقصود فطرت کو انسانوں کی جماعت میں بھی تلاش کرنا ضروری ہے۔ دوسری مخلوقات اور انسانوں میں ایک عام اور بیّن فرق یہ ہے کہ وہاں نوع کے سیکڑوں افراد ہیں اور یہاں اوصاف وخصوصیات کے اعتبار سے ہر ہر فرد اپنے مقام پر نوع مستقل ہے۔آفرینشِ انسان کی مجمل یا مفصل تاریخ پر ایک اجمالی نظر بتلاسکتی ہے کہ آج بھی انسان کی شکل وشباہت اس کے اعضاء وجوارح، اس کا ڈھانچہ، جسمانی ساخت ٹھیک وہی ہے، سب چیزیں وہی ہیں، جو دنیا کے پہلے انسان کی تھیں۔ لیکن دماغی کیفیتوں کا حال اُن سے جداگانہ ہے۔ ان میں برابر ارتقا واختلاف جاری ہے۔اب اگر انسان کی اس ارتقائے دماغی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ماقبل ومابعد ادیوں، زبانوں کی تاریخ میں ارتقائے دماغی کی آخر ترین سرحد اگر کوئی معلوم ہوسکتی ہے تو وہ ذات قدسی صفات آقائے نام دار رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

لغاتِ قاموس نے لفظ ''حمد'' کے ایک معنی

قضاء الحق کے بھی بتلائے ہیں۔ پس لفظ ''محمدؐ'' کے ایک معنیٰ یہ بھی ہیں کہ وہ جس کا حق پورا کر دیا گیا ہو یعنی قدرت کی جانب سے نوعِ انسان کو جس سرحدِ کمال تک پہنچانا مقصود تھا اور انسان کا اپنے خالق برحق پر جو حقِ تخلیق مقرر تھا وہ محمد ﷺ پر پورا کر دیا گیا۔ علم و عمل، خَلق و خُلق، دماغ و کیرکٹر ارتقائے ذہنی و ارتقائے عملی یہی دو چیزیں انسان کا خلاصہ اور اس کی کائنات تخلیق کا لُبِّ لباب ہیں۔ اول ثانی کے لیے بنیاد ہے۔ عمل علم پر، کیرکٹر دماغ پر، خُلق خَلق پر قائم ہے۔ یہ ایک عجیب نکتہ ہے جس کی تشریح کسی دوسرے مقام پر آئے گی کہ جتنی ہی کسی انسان کی حالت مکمل ہوگی اسی قدر اس کی خُلقی کیفیت راسخ و مستحکم ہوگی۔ ایک کا کمال دوسرے کے کمال کی علامت اور ایک کا نقصان دوسرے کے نقصان کی نشانی ہے۔ تاریخی طور پر یہ امر ثابت ہے کہ کیرکٹر اور اخلاق کی جملہ شاخوں کی پختگی اور تکمیل کا جو نمونہ آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک نے پیش کیا عالم انسانی اس کی نظیر سے عاجز ہے حتی کہ خود دشمنوں کے اقرار سے اس کو فرما دیا گیا ''إِنَّكَ لَعَلى خُلُقٍ عَظِيمٍ''۔

محاوراتِ عرب سے حمد کے یہ بھی معنیٰ معلوم ہوتے ہیں کہ کسی کام کو اپنی قدرت کے مطابق انجام دینا حماسیات میں نیزہ کے بھرپور پڑنے کے وقت ''حَمِدْتُ بَلَاءَهُ'' (میں نے وار پورا کیا) کا محاورہ بہت مشہور ہے۔ اس معنیٰ کو سامنے رکھتے ہوئے اور اوپر کے مضمون کو پیشِ نظر رکھ کر بے تامل کہا جاسکتا ہے کہ لفظ محمد ﷺ کے معنیٰ مخلوق کامل کے بھی ہیں۔

منجملہ دیگر کمالاتِ نبوت و معجزاتِ رسالت کے ایک معجزہ گرامی حضور اقدسؐ کا نامِ نامی بھی ہے۔ یہ زندۂ جاوید معجزہ بعثت کے وقت سے تاہنوز اپنے فضائل کی شہادتیں پیش کر رہا ہے۔ صاحبِ قاموس نے لکھا ہے کہ ''محمد الذي يحمد مرة بعد مرة'' جس کی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو، تعریف کے بعد تعریف اور توصیف پر توصیف ہوتی رہے۔ زمانہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے اور انسان اپنی سعی و کوشش کے مطابق جس درجہ ترقی کرتا جاتا ہے محض اعتقاداً نہیں بلکہ واقعتاً رسالت مآب روحی فداہ ﷺ کے کمالات سے پردہ اٹھتا جاتا ہے۔ علماء و فضلاء یورپ کی اکثریت تاریخ اسلام کے ماتحت اپنا مطالعہ جس قدر گہرا کرتی جاتی ہے، دنیا کی مختلف پریشانیوں اور بے قراریوں کو معدوم کرنے کی ضرورت جتنی ہی ان کے نزدیک بڑھتی جاتی ہے، بادلِ ناخواستہ انہیں اسی راہ کی طرف آنا پڑتا ہے اور زبانِ اعتراف کھولنا پڑتا ہے کہ بے شبہ پیغمبر عرب کے قانون دنیا کی ضرورتوں کے کفیل اور ان کی زندگی عالمِ انسان کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔ اہلِ ایشیا کا رجحان طبعی جتنا روحانیت اور سادگی کی طرف بڑھ رہا ہے اسی قدر وہ پیغمبر عالم محمد رسول اللہ ﷺ سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ دنیا کا صرف واحد معجزہ ہے کہ نام مبارک تیرہ سو برس پہلے سے اس آنے والی حالت کا پتہ دے رہا ہے۔ مستقبل میں دنیا کی عمر جس قدر دراز ہوگی خواہ وہ اپنی موجودہ حالت میں ترقی کرے جس کی بظاہر امید نہیں اور خواہ اپنے پچھلے سبق دہرائے دونوں حالتوں میں اسے کمالاتِ نبوت کے اعتراف سے چارہ نہ ہوگا۔ اس حیثیت سے نام مبارک محمد ﷺ کا ترجمہ سلسلۂ اوصاف و محامد ہوگا۔

جیسا اوپر کہا گیا ہے عام طور سے اشخاص کے نام اور اوصاف باہم کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ شاذ و نادر اتفاقی حیثیت سے تناسب بھی مل جاتا ہے اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی انسان کا وہ نام رکھا گیا ہو جو اس کی تمام زندگی کا آئینہ اور اس کے شعبہ ہائے حیات کی تفصیل ہو۔ مگر نامِ نامی آقائے نامدار اس سے مستثنیٰ ہے۔ اسی مطابقت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاص نام کے رکھنے کے متعلق ضرور عبدالمطلب کو ایک غیبی تحریک ہوئی۔ اب غور کیا جائے کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی کا خلاصہ دوست و دشمن کی یکساں تنقید، حاضر و غائب کی رائے زنی کا ماحصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ علم و عمل، ظاہر و باطن، خَلق و خُلق ہر حیثیت سے حضور ﷺ کی زندگی قابلِ تعریف تھی اور اسی خلاصۂ حیات کا ترجمہ ہے محمد ﷺ۔

اس سے بھی زیادہ عجیب امر یہ ہے کہ نامِ مبارک حضور ﷺ کے نہ صرف نبی بلکہ خاتم النبیین ہونے کی دلیل بھی ہے۔ کمال و کمالِ اخلاق بھی انبیاء علیہم السلام کی مخصوص اور ممتاز صفات میں سے ہیں، دوسرے انبیاء علیہم السلام کا کمال علمی و عملی کسی ایک خاص صفت میں مخصوص تھا لیکن حضور ﷺ کی جامعیت آپ ﷺ کی سوانح و تعلیمات سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ لفظ ''محمدؐ'' کے معنیٰ مجموعۂ خوبی اور ''مخلوق کامل'' کے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، اس کے آگے کوئی نقطہ ہی نہیں ہے۔ اسی حالت پر کمالِ کلّی کی انتہا اور معارف کا اختتام ہے جس کے بعد نہ کسی نبی کی حاجت نہ کسی نبی کا وجود ممکن ہے۔ مستشرقین یورپ میں سے جن لوگوں نے آنحضرتؐ کی سیرت پاک کا مطالعہ کیا ہے وہ باوجود ہزار سعیٔ تنقیص اعترافِ کمال پر مجبور ہوئے ہیں۔ سر ولیم میور اور مارگولیتھ جیسے سخت لوگوں کو بھی کھلے اور چھپے لفظوں میں اس کا اقرار کرنا پڑا کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم انتہائی

سچائی اور حقیقی صداقت پر مبنی نظر آتی ہے۔

عہدِ نبوت میں بھی اسی قسم کے واقعات پیش آچکے ہیں کہ بعض سخت ترین مُنکر ایک توجہ نظر اقدس کی تاب نہ لا سکے۔ عبد اللہ بن سلام جو نامور علماء یہود میں سے تھے وہ جس طرح اسلام لائے معلوم ہے۔ بعثت کے حالات، سیرتِ طیبہ، تعلیم و تلقین اپنے اندر کچھ ایسی کشش رکھتی ہے کہ مخالف سے مخالف اور سخت سے سخت حریف اعتراف پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اسی خاصیت اور بے اختیارانہ کشش کو نام مبارک میں بیان کیا گیا۔ لفظ ''محمدؐ'' عربی زبان میں تحمید سے مشتق ہے جو باب تفعیل کا مصدر ہے ۔ اس باب کے معنی کے خواص میں سے ہے کہ کسی کام کا وجود میں آنا اس طور پر مانا جائے کہ گویا کسی مخفی یا ظاہر طاقت نے اس کو وجود میں آنے کے لیے مجبور کیا جیسے صرّف (پھیر دیا) یعنی کسی طاقت نے بے اختیار کر کے پھیر دیا۔ اسی طرح ''محمدؐ'' کے معنی ہیں وہ جس کی تعریف بے اختیار کی گئی ہو۔ اس معنی سے اسی قوتِ جاذبہ اور کششِ اصلی کی طرف اشارہ ہے۔ عبد اللہ بن سلام کے متعلق مروی ہے کہ وہ چہرۂ اقدس کو دیکھتے ہی پکار اُٹھے: ''ھذا لیس بوجہ کذّاب''۔

یورپ میں بڑی ہوشیارانہ تدبیر سے محمد رسول اللہ ﷺ کو بدترین پیرایوں میں دکھلانے کی کوششیں کی گئی ہیں ، لیکن اب آج کل بعض جماعتوں اور خداترس بندوں کی طرف سے جو مساعی جمیلہ کی جارہی ہیں انہوں نے تجربہ کرادیا کہ جب کبھی اصل صورت ان کے سامنے پیش کی گئی ہے تو انہوں نے یہی کہا کہ یہی تو ہمارا کعبۂ مقصود ہے۔

اس باب کی دوسری خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی کام کے اس طور پر ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام پہلوؤں کا استقصاء کیے ہوئے ہے۔ کوئی جزو اس سے چھوٹا ہوا نہیں استعمال میں آتا ہے: ''قُتِّلُوْا تَقْتِیلًا''۔ یعنی خوب خوب قتل کیا اس خاصیت کا لحاظ کرتے ہوئے نام مبارک کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ ''محمدؐ'' یعنی جس کا جزء جزء قابل تعریف ہے۔ 'اصلاحِ نفس'، 'تدبیرِ منزل' اور 'تدبیرِ مدن' کی وہ کون سی شاخ ہے جس کا عملی نمونہ ذاتِ قُدسی صفات محمد رسول اللہ ﷺ نے پیش نہیں کردیا۔

انبیاء علیہم السلام کا تمام تر سلسلہ عالم میں ایک خاص ترتیب و نظام کے ساتھ آیا اور ہر ایک اپنے اندر کوئی نہ کوئی کمالِ اخلاقی یا عرفانی یا انتظامی لایا۔ یہ بابرکت سلسلہ جب اپنی حدونہایت کو پہنچا تو ضرورت ہوئی کہ عالمِ انسان کے سامنے ایک ایسا نمونہ کامل پیش کیا جائے جو ان تمام صفات کا مجمع اور فضائل کا آئینہ ہو۔ جس کی زندگی کو سامنے رکھنے سے موسویانہ مستی، مسیحانہ اخلاق، ابراہیمی محبت بیک وقت نظر کے سامنے آجائے۔ اور پھر ان تمام اوصاف میں وہ اپنے متقدمین سے بالاتر ہو۔ وہ ہستی جامع اور برزخ کامل ذاتِ پاک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہے۔ اس لیے حضرت مسیحؑ نے اپنی بشارت میں لفظ ''احمدؐ'' فرمایا۔ یعنی وہ آئے گا جو اپنے تمام پہلے والوں کا سردار اور سب پر فائق ہوگا۔

دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب نے اپنی کامل نشوونما جب ہی پائی ہے جب وہ معرفت وروحانیت کی آغوش سے نکل کر سلطنت اور حکومت کی گود میں چلے گئے ہیں۔ مسیحی مذہب کی ترقی رُومی بادشاہوں کی رہین احسان ہے۔ بودھ نے بہت کچھ تبلیغ کی لیکن اس کا عالم گیر مذہب بھی اسی وقت اپنی تکمیل کرسکا جب وہ اشوک خاندان کی سرپرستی میں آگیا۔ لیکن اسلام اپنی تاریخ میں بالکل علٰیحدہ ہے۔ وہ جن جن ملکوں میں گیا اور جن جن جماعتوں میں پھیلا، اخلاق وروحانیت سے گیا۔ غریب تلوار، اسلام میں روحانیت اور مذہب کے داخلہ کے بعد گئی ہے۔ افریقہ اور ہندوستان کی نظیریں اس بارہ میں بہت صاف ہیں۔ اس خاص نعمت تبلیغ کو بھی نام مبارک میں ظاہر کردیا گیا ہے: ''فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ''۔ بظاہر اسباب ان مفاسد کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی لیکن فطرت کی تدبیریں اندر اندر جاری رہتی ہیں اور ایک وقتِ معیّن پر ظاہر ہوجاتی ہیں۔ فطرت کی رفتار ہوا کی طرح تیز اور سیلاب کی طرح نرم ہوتی ہے۔ خوش تدبیری اور حسن اسلوب کے موقع پر بھی حمد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ پس لفظ ''محمد ﷺ'' کے ایک یہ بھی معنی قرار دیے جاسکتے ہیں کہ وہ جس کے ساتھ خوش تدبیری نے ترقی کی۔ آپؐ کی تعلیم کا انتشار، آپؐ کا لایا ہوا دین خدا کی خاص مرضی اور خاص تدبیر سے عالم میں پھیل گیا جس کی سُرعت اور بغیر جدوجہد رفتارِ ترقی سے اس وقت بھی دنیا متحیّر ہے۔

الغرض اسلام کی تمام معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کا نامِ مبارک بھی اپنے معانی کے لحاظ سے مختلف خوبیوں کا مرقع بہتیرے فضائل کا خلاصہ ہے۔ ایک طرف وہ اپنے مسمّٰی کے کام اور کام کے انجام کی پیشین گوئی ہے، دوسری طرف اُس کے کاموں کی تاریخ اور اس کی تعلیم کا لُبِّ لباب ہے۔

پاک ہے وہ اللہ جس نے اپنے نبی کا ایسا پاک نام رکھا، اور پاکیزہ ہے وہ نبی جسے اس کے معبود نے ایسی فضیلتوں سے آراستہ کیا۔

☆☆☆

اسوۂ حسنہ

سیرتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عملی پیغام

مولانا سید محمد جعفر مسعود حسنی ندویؒ (سابق ناظر عام ندوۃ العلماء)

ماہ ربیع الاول کی آمد آمد ہے، اس کے مبارک موقع پر عید میلاد النبی کی محفلیں سجتی ہیں، خطباء اور واعظین کی پر جوش وولولہ انگیز تقریریں ہوتی ہیں، نعتیہ مشاعروں کا اہتمام ہوتا ہے، اور پوری رات یہ سلسلہ جاری رہ کر صبح کی اذان پر اختتام کو پہنچتا ہے، لیکن پوری رات جاگ کر جب لوگ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں تو وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ حضور پاک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گھریلو زندگی اور سماجی زندگی کیسی تھی، وہ معراج کا واقعہ بیان کر سکتے ہیں، غزوۂ احد کی تفصیلات آپ کے سامنے رکھ سکتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات پر روشنی ڈال سکتے ہیں، غار حرا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کی منظر کشی کر سکتے ہیں، مکہ سے مدینہ ہجرت کی روداد بیان کر سکتے ہیں، مدینہ میں ہونے والے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے استقبال کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی ''قصوا'' کے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے دروازہ پر ٹھہرنے کا منظر بیان کر سکتے ہیں، لیکن آپؐ کی گھریلو اور سماجی زندگی کے بارے میں وہ بالکل لاعلم اور خاموش نظر آتے ہیں، حالانکہ سیرت پاک کا وہ پہلو جو گھریلو اور سماجی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، انسانی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، عبادات کے معاملہ میں سیرت ہماری یقیناً پوری رہنمائی کرتی ہے بلکہ عبادت کو قابل قبول بنانے میں سیرت کا بنیادی کردار ہے، اگر عبادات میں سنتوں کا خیال نہ رکھا جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق اس عبادت کو انجام نہ دیا جائے تو وہ عبادت بے روح اور بے جان ہے، اور اس عبادت کے وہ اثرات مرتب نہیں ہو سکتے جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

لیکن کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سارا وقت مسجدوں میں گزرا؟ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان ضروریات سے مبرا تھے جو ضروریات انسانی زندگی میں پیش آتی ہیں؟ کیا آپؐ نے اپنی زندگی کے بیشتر لمحات صحراؤں اور غاروں میں گزارے جہاں انسانوں سے سابقہ کم پڑتا ہے؟، اگر ایسا ہوتا تو یہ آیت ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' بے معنی ہو کر رہ جاتی، یقیناً آپؐ کی زندگی میں وہ تمام مسائل پیش آئے جو کسی بھی انسان کو عمر کے کسی بھی مرحلہ میں پیش آسکتے ہیں، آپؐ کا بچپن بھی گزرا، جوانی بھی گزری اور جوانی کے بعد کا مرحلہ بھی گزرا، بچپن کی خواہشات، جوانی کے تقاضے اور جوانی کے بعد کے مسائل بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش آئے، رہن سہن، طرز زندگی اور لین دین کے سلسلہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کے سامنے ایک نمونہ پیش کر کے دکھادیا، ہمیں ان نمونوں کو بھی سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

ہم وضو میں خیال کرتے ہیں سنتوں کا، غسل میں اہتمام کرتے ہیں مسنون طریقہ اپنانے کا، پانی پیتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ بیٹھ کر پئیں، اور تین سانسوں میں پئیں، کھانے میں دایاں ہاتھ استعمال کرتے ہیں، پلیٹ صاف کرتے ہیں، انگلیاں چاٹتے ہیں، کھانے کے بعد کی دعا پڑھتے ہیں، کیوں کہ ہمارے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں یہ سب بتایا، بلکہ کر کے دکھایا، لیکن کیا حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف انہی چیزوں میں ہماری رہنمائی فرمائی جو ہماری انفرادی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں؟ اور کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف انہی چیزوں کے سلسلہ میں ہمیں ہدایات عطا فرمائیں جن کو عبادات کہا جاتا ہے؟

کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھر میں رہنے کے آداب نہیں بتائے؟ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سڑک پر چلنے کا طریقہ بیان نہیں فرمایا؟ کیا راستہ پر کھڑے رہنے والوں پر آپ نے کچھ ذمہ داریاں نہیں ڈالیں؟ کیا پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں دی؟ کیا راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹانے کو صدقہ قرار نہیں دیا؟ کیا بیمار کی عیادت کی فضیلت کے سلسلے میں زبان نبوت خاموش ہے؟ کیا مسلمان بھائی سے مسکرا کر ملنا باعث اجر وثواب نہیں ہے؟ کیا نرم دلی، نرم مزاجی، تواضع اور انکساری صفات نبویہ میں سے نہیں ہیں؟

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کس نے فرمائی؟ بیوی کے حقوق ادا کرنے پر زور کس نے دیا؟ یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کی کفالت کرنے پر بشارت کس نے دی؟ امانت دار تاجر کے لیے حشر کی گرمی میں عرش کے سایہ کا وعدہ کس نے کیا؟ غیبت، چغل خوری، الزام تراشی اور عیب جوئی کو بدترین گناہ کس نے قرار دیا؟ جھوٹ، خیانت، اور وعدہ خلافی کو نفاق کی علامتوں میں کس نے شمار کیا؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں خوشی کے لمحات بھی آئے، اور حزن وملال کے بھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چہیتی بیٹیوں کو دلہن بنا کر رخصت بھی کیا اور اپنے لخت جگر حضرت ابراہیمؓ کو اپنے ہاتھوں قبر میں اتارا بھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میدان جنگ

میں اسلامی لشکر کو آگے بڑھتے ہوئے بھی دیکھا اور پیچھے ہٹتے ہوئے بھی، صلح کے واقعات بھی آپ ﷺ کی زندگی میں پیش آئے اور جنگ کے بھی، آپ ﷺ نے جان چھڑکنے والے صحابہ کرام کی محبت بھی دیکھی اور خون کے پیاسے دشمنوں کی عداوت بھی، آپ ﷺ نے معاف کرکے بھی دکھایا اور تنبیہ فرماکر بھی، آپ ﷺ نے دفاع بھی کیا اور اقدام بھی، آپ ﷺ کو سابقہ قیدیوں سے بھی پڑا اور غلاموں سے بھی، امراء سے بھی اور سرداروں سے بھی، آپ ﷺ نے خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلانے کا سبق دیا، اپنوں کو محروم رکھ کر غیروں کو نوازنے کا نمونہ پیش کیا، پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدور کو اس کی مزدوری کی تلقین کی، خواتین کے ساتھ نرمی برتنے کا حکم دیا، امیر کی اطاعت کو لازم قرار دیا۔

آپ ﷺ کی مجلس کے بارے میں آتا ہے کہ وہ علم وحیا کی مجلس ہوتی تھی، نہ اس میں کسی پر تہمت لگتی تھی، نہ کسی پر الزام تراشی ہوتی تھی، نہ کسی کا راز کھلتا تھا، نہ کسی کے عیب کا چرچا ہوتا تھا، نہ کسی کی رسوائی کا کسی کو کوئی موقع ملتا تھا، اس میں صبر کی تلقین ہوتی تھی، امانت ودیانت داری کا سبق ہوتا تھا، علم وحکمت کی باتیں ہوتی تھیں، اس میں ہر بڑا قابل احترام تھا اور ہر چھوٹا لائق عنایت وشفقت۔

ذرا آپ ﷺ کے گھر پر نظر ڈالیے، صرف ایک کمرہ ہے اور وہ بھی اتنا تنگ کہ آپ ﷺ نماز پڑھتے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے پاؤں نہیں پھیلا سکتی تھیں، اسی لیے روایات میں آتا ہے کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیام میں یا رکوع میں ہوتے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے پاؤں پھیلائے رہتیں اور جب آپ ﷺ سجدہ میں جاتے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے پاؤں سمیٹ لیتیں، تب آپ ﷺ سجدہ فرماتے، اتنا تنگ مکان اور اتنی تنگ آرام گاہ تھی آپ کی، اس مکان کے فرنیچر کو تو دیکھیے، صرف اور صرف دو چیزیں تھیں، ایک تخت اور صرف ایک کرسی تھی، جس کے چار پائے تھے، اور وہ لوہے کے تھے، باقی اس میں لکڑی فٹ تھی، ان دو چیزوں کے علاوہ کوئی چیز آپ ﷺ کے گھر میں بطور فرنیچر نہیں تھی۔

دروازہ پر پردہ ضرور تھا، لیکن وہ بھی بہت معمولی، آرائش کے لیے نہیں، سجاوٹ کے لیے نہیں، مکان کے زیب و زینت بڑھانے کے لیے نہیں، بلکہ صرف اس لیے کہ اچانک دروازہ کھلنے پر بے پردگی نہ ہو اور اگر دروازہ پر کوئی کھڑا ہو جائے تو سامنا نہ ہو۔

گھر میں آپ ﷺ کا وقت کیسے گزرتا تھا؟ وہ بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زبانی سنیے، فرماتی ہیں: آپ ﷺ سخت مزاج شوہروں کی طرح نہیں تھے، اپنے کپڑے خود ہی سی لیتے، خود ہی چپل ٹانک لیتے، خود بکری کا دودھ دوہ لیا کرتے تھے، اور گھر میں آپ ﷺ اسی طرح کام کاج کرتے تھے، جس طرح دوسرے تمام مرد اپنے گھروں میں کام کرتے ہیں، آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں''۔

بچوں کے ساتھ آپ کا رویہ اتنا محبت آمیز ہوتا تھا کہ بچے آپ ﷺ کے گرویدہ ہوجاتے تھے، بچوں سے آپ ﷺ بہت پیار فرماتے، خود ہی ان کو سلام کرتے، ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے، ان کے درمیان کبھی کبھی مقابلہ کرا دیتے، جب آپ ﷺ سفر سے واپس تشریف لاتے تو گھر کے بچے آپ ﷺ کا استقبال کرنے دوڑتے، آپ ﷺ کسی کو پیار، کسی کو اپنی سواری پر پیچھے بٹھا لیتے، کسی کو ہاتھوں پر اٹھا لیتے اور گود میں لے لیا کرتے۔

غریبوں، کمزوروں، مریضوں سے ملنے خود جاتے، اور ان کے غم کے ازالہ کی تدبیریں کرتے، ان کی پریشانیوں اور تکلیفوں پر اجر و ثواب کی امید دلا کر ان کے احساسات کو بدلنے کی کوشش کرتے۔

آپ ﷺ نے اس ولیمہ کو بدترین ولیمہ قرار دیا جس ولیمہ میں امیروں کو تو دعوت دی جائے اور غریبوں کو، مسکینوں کو نظر انداز کردیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں مسکینوں سے محبت کرتا ہوں۔

اب آیئے ایک نظر ڈالتے ہیں نبی آخر الزماں محمد ﷺ کی آخری ہدایات بلکہ آپ ﷺ کی وصیت پر، ذرا سوچیے دل پر ہاتھ رکھ کے، کس کی وصیت ہے؟ کس کو کی جارہی ہے؟ کس موقع پر کی جارہی ہے؟ ایک باپ وصیت کرتا ہے تو اولاد کے لیے اس سے زیادہ عار کی بات اور کوئی سمجھی نہیں جاتی کہ اولاد نے اپنے باپ کی وصیت پر عمل نہیں کیا، چہ جائیکہ وصیت کرنے والی ذات نبوی ہو، جس کے لیے محبت و احترام اور اطاعت و فرمانبرداری کی ادنیٰ سے کمی صاحب ایمان کو ایمان کے دائرے سے باہر کردینے کے لیے کافی ہے، خود آپ ہی کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کو اس کے والدین اور خود اس کی جان سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔

☆☆☆

تاریخ وتذکرہ

تعارف وتبصرہ

تذکرہ شاہ ولی اللہؒ
(ماہنامہ الفرقان کا خاص نمبر)

مولانا عتیق احمد بستوی (سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء)

اردو زبان کے جن ماہناموں کا مطالعہ یہ حقیر زمانہ طالب علمی سے برابر کرتا رہا، ان میں ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، اور ماہنامہ برہان دہلی کے علاوہ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ بھی شامل تھا، ماہنامہ برہان (ندوۃ المصنفین دہلی) مدت ہوئی مرحوم ہو چکا ہے، لیکن الحمدللہ معارف اور الفرقان برابر شائع ہو رہے ہیں اور اپنی علمی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، میرے ذہن ومزاج کی تشکیل میں ان تینوں ماہناموں کا خاصہ دخل ہے، الفرقان کی خصوصی اشاعت جو حضرت شاہ ولی اللہ کی شخصیت اور کارناموں کو اجاگر کرتی ہے اور اپنے موضوع پر علمی اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، اس کا مطالعہ میں نے دور طالب علمی میں بڑے ذوق وشوق اور گرویدگی کے ساتھ کیا، خصوصاً حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، اور حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کے مضامین کو بار بار پڑھنے کی توفیق نصیب ہوئی اور ان دونوں تحقیقی اور فکر انگیز مضامین کی برکت سے حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم وافکار اور ان کی دینی خدمات وکمالات کو سمجھنے میں بہت آسانی ہوئی، حضرت شاہ ولی اللہ پر الفرقان کا یہ خصوصی نمبر پہلی بار فروری ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا، اور اس کی دوسری اشاعت اسی سال میں چند ماہ کے بعد ہوئی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ایڈیشنوں سے متعلق پوری تفصیل بانی ماہنامہ الفرقان حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے قلم سے پڑھ لی جائے، رقمطراز ہیں:

”حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے تذکار کا جو مجموعہ اس وقت آپ کے سامنے ہے یہ ماہنامہ الفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر کا دوسرا ایڈیشن ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ماہ محرم الحرام ۱۳۶۰ھ (مطابق فروری ۱۹۴۱ء) میں شائع ہوا تھا، جس کو الفرقان کے چار ماہ کے عام پرچوں (بابت ماہ رمضان تا ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ، اکتوبر تا جنوری ۱۹۴۰-۴۱ھ) کے قائم مقام کر دیا گیا تھا۔

جس وقت اس کی طباعت شروع کرائی گئی تھی ”الفرقان“ کے مستقل خریداروں اور صرف نمبر کا آرڈر دینے والوں کی مجموعی تعداد ایک ہزار سے کم تھی، اگرچہ کاغذ بے حد گراں تھا، لیکن پھر بھی ہمت کر کے ساڑھے بارہ سو چھپوا لیا گیا، لیکن خلاف توقع دوران طباعت ہی میں آرڈر بہت زیادہ آ گئے، یہاں تک کہ وسط فروری میں جب روانگی شروع ہوئی تو ابھی آمدہ فرمائشیں کچھ باقی ہی تھیں کہ نمبر ختم ہو گیا، اس کے بعد جو آرڈر آئے مجبوراً ان کو انکاری جواب دینا پڑا۔

اب ہر طرف سے دوسرے ایڈیشن کے لئے اصرار شروع ہوا، کاغذ کی ہوش اڑا دینے والی روز افزوں گرانی کو دیکھتے ہوئے ہمت نہ ہوتی تھی، لیکن قدردان دوستوں کے اصرار نے اس درجہ مجبور کیا کہ اپنی گنجائش اور برداشت کے سوال سے قطع نظر کر کے کمر ہمت کس لینی پڑی، اور صفر ۱۳۶۰ھ (مارچ ۱۹۴۱ء) کے دوسرے ہفتے میں کاغذ کے انتظام کے لئے دہلی پہنچ گیا، یہاں یہ دیکھ کر کہ اس ڈیڑھ دو مہینے میں کاغذ کے دام دو چند سے سہ چند ہو چکے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ سر چکرا گیا اور ارادہ مضمحل ہونے لگا، لیکن دلی کے ہمت افزا دوستوں نے ہمت افزائی فرما کر پھر اس ارادے میں استوار کر دیا، صرف ایک ہزار نسخوں کے لئے قریباً چھ سو روپے کا محض کاغذ خریدا گیا، کچھ کم وبیش اسی قدر کتابت وطباعت وغیرہ باقی اور کاموں پر صرف ہوئے، اور پورا ایک مہینہ اس میں اس درجے انہماک رہا کہ دوسرے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا جاسکا، اسی طرح یہ دوسرا ایڈیشن تیار ہوسکا ہے

اس کی مسرت ہے کہ اس دوسرے ایڈیشن کے بہانے اس نمبر کی تکمیل ہو گئی، اور بعض وہ خامیاں جو پہلے ایڈیشن میں رہ گئی تھیں بحمداللہ اب وہ نہیں رہیں۔“ (تذکرہ شاہ ولی اللہ، مضمون: چند کلمات دوسرے ایڈیشن کے متعلق، ۵۳و۵۴)

غور کرنے والوں کو اسی ”تذکرہ“ کے ضمن میں بہت سی ایسی چیزیں بھی ملیں گی جو اس نازک وقت میں جب کہ جنگ یورپ کی وجہ سے آرڈیننس کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے، براہ راست اور کھول کر نہیں کہی جاسکتیں، تاہم یہ واقعہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے کام اور پیغام کے ابھی بہت سے گوشے ایسے باقی رہ گئے ہیں جن پر اس مجموعے میں کچھ نہیں لکھا جاسکا، یا بہت ہی مجمل لکھا جاسکا ہے، اس کے لئے ہمارے دوسرے شاہ ولی اللہ نمبر کا انتظار فرمایئے، گویا یہ پیش نظر نمبر ”سیرت شاہ ولی اللہ“ کی پہلی جلد ہے، اور وہ دوسرا شاہ ولی اللہ نمبر اس کی دوسری جلد ہوگی، اس لئے اس مجموعے کے اس دوسرے ایڈیشن کو ہم نے خاص طور سے تذکرہ شاہ ولی اللہ ہی کے نام سے موسوم کر دیا ہے، ان شاء اللہ تعالی ہمارا دوسرا نمبر ولی الٰہی کام اور پیغام کی تجدید واحیاء کے اس قرض کو ادا کر دے گا، جو

ڈیڑھ سو برس سے مسلمانان ہند کے ذمہ ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
مدیر الفرقان بریلی
ربیع الاول ۱۳۶۰ھ
اپریل ۱۹۴۱ء

ماہنامہ الفرقان جس کا آغاز حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۳۴ء میں یوپی کے مشہور شہر بریلی سے کیا تھا، اور کافی عرصے تک بریلی سے نکلتا رہا، پھر یوپی کی راجدھانی لکھنؤ منتقل ہوا، اور الحمد للہ اب تک تسلسل کے ساتھ یہ علمی، دینی فکری، تحقیقی اور اصلاحی ماہنامہ بانیٔ ماہنامہ الفرقان حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند جلیل حضرت مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی کی ادارت میں شائع ہورہا ہے۔

یہ ماہنامہ صرف رسالہ نہیں ہے، بلکہ ایک عظیم دینی ایمانی، دعوتی اور فکری تحریک ہے، جو اپنے بانی کے لئے صدقۂ جاریہ اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے سرمایۂ عزت وافتخار ہے۔

ماہنامہ ''الفرقان'' کی دو خصوصی اشاعتیں بہت مشہور اور مقبول ہوئیں، ایک حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ پر ''الفرقان'' کا خصوصی نمبر جو بعد میں بھی کتابی صورت میں شائع ہوتا رہا، دوسرا حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ علیہ کی شخصیت اور کارناموں پر الفرقان کا خصوصی نمبر جو زمانۂ دراز سے ناپید ہے، اور اہل علم اس کے لئے ترستے ہیں۔

انتہائی مسرت کی بات ہے کہ الفرقان بکڈپو لکھنؤ نے اس خصوصی نمبر کو بڑے اہتمام اور آب و تاب کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ علیہ پر شائع ہونے والا الفرقان کا یہ نمبر ایک عظیم دستاویز ہے، جسے اہل علم کی ذاتی لائبریری میں ہونا چاہئے، اور اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہئے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ الفرقان کے مختلف شماروں میں تیزی سے بڑھتی ہوئی گرانی کی نشاندہی بہت باریک بینی سے کرتے تھے، مذکورہ بالا اقتباس میں کاغذ کے دام دو چند سے سہ چند ہوجانے کا جو شکوہ فرمایا ہے اس کے باوجود موجودہ گرانی کے مقابلے میں اس وقت کی ارزانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ماہنامہ الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر جس کی ضخامت پانچ سو صفحات سے کم نہیں تھی، اس کے ہزار نسخون کے لئے جو کاغذ خریدا گیا اس کی قیمت چھ سو روپے تھی، اور کچھ کم وبیش اسی قدر کتابت و طباعت وغیرہ باقی اور کاموں پر صرف ہوئے۔

یعنی کل بارہ سو روپے میں الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر کی ایک ہزار کاپیاں تیار ہوگئیں، فی نسخہ بارہ روپے لاگت آئی، یہ بات ملحوظ رہے کہ ماہنامہ الفرقان کا سائز آج کل کی مروجہ کتابوں سے بڑا ہوتا تھا، آج کل اس سائز کی پانچ سو صفحات کی کتاب کی لاگت ساڑھے تین سو سے کم نہیں ہوگی، اس کا معنی یہ ہے کہ ۱۹۴۱ء کے مقابلہ میں ۲۰۲۶ء میں کم وبیش تیس گنا گرانی بڑھ چکی ہے، اور اب تو گرانی کوئی شکایت کی چیز نہیں رہی، روز کا معمول بن گئی ہے۔

خود الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر کے مرتب حضرت مولانا نعمانی رحمہ اللہ علیہ نے اس نمبر کے بارے میں جو تاثر قلمبند کیا ہے، اسے بھی ہم انہی کے الفاظ میں پڑھ لیتے ہیں، حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''کوئی شک نہیں کہ ان اضافات نے نمبر کی جامعیت اور افادی حیثیت کو بہت کچھ بڑھا دیا ہے۔ اور تحدیثاً بالنعمہ اب اس کے اظہار میں مجھے کوئی باک نہیں کہ مضامین و مقالات کا یہ مجموعہ صرف ایک رسالے کا خصوصی نمبر ہی نہیں ہے، بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک اچھی خاصی جامع سیرت ہے، جس میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے مذہبی وسیاسی ماحول، آپ کی دعوت اصلاح و ارشاد اور آپ کے تجدیدی کارناموں کا تذکرہ تحقیق و تدقیق کے ساتھ اسی قدر بسط و تفصیل سے آگیا ہے کہ غالباً بلکہ (ان شاء اللہ یقیناً) دوسری جگہ کہیں نہیں مل سکتا، پھر یہ صرف تذکرہ ہی نہیں ہے۔ اور نہ صرف داستان سرائی اس کا مقصد ہے، بلکہ مدعا اسی ساری دردسری اور تاریخ ماضی کی تذکیر کا یہ ہے کہ تاریکی کے اس دور میں ہم اسلامیان ہند بجائے اس کے کہ (بقول مولانا گیلانی) ''مغربی لیمپ'' یا ''ہندی ڈیوٹ'' سے روشنی حاصل کریں، کیوں نہ اپنے ان ربانی بزرگوں کی ہدایات کو شمع راہ بنائیں جن کا سرمایہ صرف ''اپنا سوچ بچار'' ہی نہ تھا، بلکہ کتاب وسنت میں تفکر اور اجتہادی بصیرت کے علاوہ الہام ربانی، عنایت الٰہی اور فیض روح القدس کی تائید وتسدید بھی ان کو حاصل تھی۔

صرف اسی مقصد کو سامنے رکھ کر یہ کام کیا گیا ہے، اور کیا جارہا ہے، اور اسی واسطے اس مجموعہ میں خاص طور پر شاہ ولی اللہ کے ان حالات اور آپ کی ان مجددانہ خدمات کو اجاگر کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی ہے جن سے عہد حاضر کے مسلمان سبق لے کر اپنے لئے راہ عمل طے کرسکتے ہیں۔''

(سابقہ حوالہ، مضمون چند کلمات صفحہ ۵۵)

الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر کی اہمیت جاننے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ اس دور کے ممتاز ترین اہل علم وفکر کی قیمتی تحریریں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ

اللہ علیہ کی شخصیت، خدمات اور کمالات کے مختلف پہلوؤں پر اس نمبر میں شامل ہیں، اور ہر مضمون بڑی عرق ریزی محنت اور گہرے غور وفکر کے بعد لکھا گیا ہے۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون مضمون نہیں ہے بلکہ پوری کتاب ہے، نئی اشاعت کے صفحہ ۸۵ سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور صفحہ ۲۵۳ پر ختم ہوتا ہے، تقریباً ایک سو اسی ۱۸۰ صفحات پر یہ مضمون مشتمل ہے، دوسرا اہم ترین مضمون حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جس میں خاص طور سے حضرت شاہ صاحب کے علوم و افکار کا تفصیل سے تجزیہ اور تعارف کرایا گیا ہے، یہ مضمون صفحہ ۲۶۱ سے شروع ہو کر ۳۶۶ پر ختم ہوتا ہے، اس مضمون کے مجموعی صفحات ۱۰۵ ہوئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی جو اپنے دور میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و افکار کے بہترین شارح اور ماہر تھے انہوں نے اپنے اس مضمون میں شاہ صاحب کے علوم و افکار کے تعارف کرانے کا حق ادا کر دیا۔

ان دونوں بزرگوں کے علاوہ جن اہل فکر وتحقیق علماء کے گرانقدر مضامین اس نمبر کی زینت ہیں ان میں سے چند یہ ہیں: (۱) علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۲) حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ (۳) حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ (۴) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۵) حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (۶) حضرت مولانا مسعود عالم ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۷) حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ (۸) حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ جن کی تگ ودو، محنت اور توجہ سے یہ عظیم الشان شاہ ولی اللہ نمبر شائع ہوا، انہوں نے خود اس نمبر کے لئے بہت مفصل مقالہ تحریر فرمایا تھا، جو اس نمبر کے ڈیڑھ سو صفحات کا احاطہ کرتا، لیکن انہوں نے دوسرے آنے والے مضامین کی وجہ سے اپنا یہ مضمون اس نمبر میں شامل نہیں کیا، کیونکہ صفحات بہت زیادہ بڑھ جاتے جس کا اس وقت تحمل نہیں تھا، خدا کرے حضرت مولانا کے مسودات میں کہیں یہ مبسوط مقالہ محفوظ ہو، اس بارے میں مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نمبر میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسے یہاں نقل کر دینا ضروری ہے، کیوں کہ اس سے اس خاکہ کا بھی پتہ چلتا ہے جو مولانا مرحوم نے شاہ ولی اللہ نمبر کی جلد دوم کے لئے اپنے ذہن میں تیار کر رکھا تھا، اور جس کی اشاعت وہ نہیں کر سکے، ملاحظہ فرمائیں:

’’درحقیقت میں نے اس نمبر کے لئے جو مقالہ قریباً آٹھ دس مہینے کے مطالعے اور محنت کے بعد شاہ صاحب کے سوانح و علمی خدمات اور آپ کی مساعی تجدید وارشاد پر پورے بسط و تفصیل سے لکھا تھا، اور جو اس نمبر کے قریباً ڈیڑھ سو صفحات میں سماتا، نمبر کی ضخامت اندازہ سے بڑھ جانے اور اس سے زیادہ فخامت کا انتظام نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کو روک لینا پڑا، دوسرے حضرات سے جو مقالات حاصل کئے گئے تھے ان میں سے کسی کا روکنا میں نے اخلاقاً اچھا نہ سمجھا، نیز میں نے اپنے مقالہ کو کسی دوسرے مقالہ پر ترجیح کے قابل بھی نہیں سمجھا، اس لئے اسی کو روک لیا، لیکن اب اس اتفاقی مجبوری میں ایک خیر کی صورت بھی پیدا ہوگئی، اور وہ یہ کہ اس نمبر میں حضرت شاہ صاحبؒ اور آپ کے علوم و خدمات کے تعارف کے سلسلے میں بہت کچھ بلکہ سب کچھ آجانے کے باوجود آپ کے ان علوم کا حصہ کم آسکا جن کی فی زماننا اسلامی دنیا کو شدید احتیاج (ضرورت) ہے۔

میں نے اپنے اس مقالہ میں قریباً سو صفحات پر آپ کی صرف اس قسم کی تعلیمات کے اقتباسات لئے تھے، لیکن چونکہ اس کی تیاری کے وقت صفحات کی محدود وسعت سامنے رکھ لی گئی تھی، اس لئے بہت سے مسائل میں پھر بھی بہت اختصار سے کام لینا پڑا تھا، اب جب کہ ایک اتفاقی مجبوری سے وہ مقالہ اشاعت سے رہ گیا تو اس کو اب ازسرنو پھر سے ترتیب دینے کا ارادہ ہے، اس طرح کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو مباحث اس نمبر میں کافی تفصیل سے آگئے ہیں، ان کو تو اس سے بالکل ہی نکال دیا جائے، اور جو مضامین اس میں نہیں آسکے یا نا کافی درجہ میں آسکے ہیں ان کو پورے شرح وبسط کے ساتھ لکھا جائے، بالخصوص تفسیر قرآن، شرح حدیث، تنقیح فقہ، تنقید تصوف، مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی اعتقادی وعملی اصلاح، فلسفہ تشریع، اسلام کے نظریہ سیاسی اور نظام خلافت و امارت کی تشریح، اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر اقتصادیات کی تنظیم، غرض کہ ان تمام اہم مباحث پر حضرت شاہ صاحب نے اپنی تصانیف کے ہزارہا صفحات میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے، ارادہ ہے کہ اقتباسات لے کر اس مقالہ کو ایک مستقل کتاب کر دیا جائے، اور الفرقان کے دوسرے ’’شاہ ولی اللہ نمبر‘‘ کی حیثیت سے اس کو شائع کر دیا جائے، اب یہی طے کر لیا گیا ہے۔‘‘

(تذکرہ شاہ ولی اللہ، نگاہ اولین، میرا اصل مقالہ، مضمون: حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صفحہ: ۴۶، ۴۷، ناشر الفرقان بکڈپو لکھنؤ، سن اشاعت جون ۲۰۲۶)

(باقی صفحہ نمبر ۲۵ ؍پر)

رسولِ انسانیت

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہمہ گیر فیضان

مولانا عبد السبحان ناخدا ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

آج سے چودہ سو سال پہلے وادیٔ مکہ میں انسانیت کی جو شمع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روشن کی تھی، اسی سے آج سارا جہاں روشن ہے۔ اس وقت حالات اس قدر نازک تھے کہ تاریخ کی آنکھوں نے اس سے نازک دور کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ انسانیت نے حیوانیت اور بربریت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے، اعلیٰ انسانی اقدار اپنا مفہوم کھو چکے تھے، طاقت، دولت، ظلم، جبر اور زندگی کی سہولتوں پر زبردستی قبضہ کو انسانی کمال کی آخری حد قرار دیا جارہا تھا، انسانی خون پانی سے زیادہ ارزاں تھا، خواتین کی عزت وحرمت کا تصور بھی گناہ تھا، انسانی ذہن اس قدر سکڑ چکا تھا کہ اپنی ذات سے آگے کچھ اور سوچنا سب سے بڑی حماقت تھی، کسی نے دل بہت وسیع کرلیا تو اپنے قبیلے تک اسے پھیلا دیا، اس سے آگے بڑھنا محال تھا، بڑی بڑی سلطنتیں قوتوں کی بنیاد پر انسان اور انسان کے درمیان فرق کرتی تھیں، دنیا میں انسانوں کی ایک بھیڑ تھی لیکن ''انسان'' کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس وقت خالقِ کائنات نے اس انسانِ اعظم کو بھیجا جس نے واقعی پورے عالم کی کایا پلٹ دی، انسانوں کو انسانیت کی بنا پر جڑنا سکھایا، قومیت اور وطنیت کے بت توڑے، کمالِ انسانی کے اصل معیار قائم کیے، اور انہی معیار پر انسانوں کو جانچنے کا سلیقہ سکھایا، ظلم، جبر اور طاقت و دولت کی ہوس کی جگہ انصاف، عدل اور ایثار و قربانی کی شمعیں فروزاں کیں، انسانی جان کی قیمت اتنی اونچی لگائی کہ ایک خونِ ناحق کو کل انسانیت کا قتل قرار دیا، ایک انسان کی زندگی بحال کرنا پوری انسانیت کو زندگی عطا کرنے کے متبادل قرار دیا۔ معصوم بچوں کے چہروں پر زندگی کی بہاریں لوٹائیں، جن کو زندہ دفن کرکے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا جاتا تھا، خالقِ کائنات نے خود اس عظیم نبی کو بچوں سے نوازا تھا کہ دنیا دیکھے کہ بچوں کو کس طرح نازوں سے پالا جاتا ہے۔ جس زمانہ میں خواتین کی عزت وحرمت کا کوئی تصور تک نہ تھا، انسانیت کے اس محسن نے عین اسی زمانہ میں عورت کو ماں بنا کر جنت اس کے قدموں تلے بچھا دی، بیوی کے روپ میں اسے سب سے انمول متاعِ کائنات قرار دیا، بیٹی کی تربیت پر جنت کی ضمانت دی، عورت کو مرکزِ محبت قرار دیا اور نازک آبگینوں کی بے مثال سے تشبیہ دے کر پوری کائنات کو رنگِ انوار سے معمور فرمایا۔ اس عظیم انسان کی عظمت کی گواہی خود خالقِ کائنات نے یوں دی: ''وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ'' (یعنی اے محمد! آپ بلا شبہ عظیم ترین اخلاق سے آراستہ ہیں)، ایک اور جگہ اسی عظیم ہستی کا تعارف یوں کیا ہے: ''وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ'' (یہ نبی انسانوں کے بوجھ اور زنجیروں سے ان کو آزاد کرتا ہے جو ان پر لدی ہوئی ہیں)، اس کی زندگی اور بندگی کو دیکھ کر خالقِ ارض وسماء نے اسے وہ اعزاز بخشا جو اس سے پہلے اور بعد کسی کو نہ مل سکا، اس لیے رحمۃ للعالمین کا لقب تجویز ہوا، یعنی سارے جہانوں کے لیے رحمت۔

اس کا وجود خود رحمتِ الٰہی کا فیضان تھا، اس کی بعثت سے پہلے اللہ رب العزت نے ساری کائنات پر نظر کی تو کیا عرب، کیا عجم! کوئی اسے پسند نہیں آیا، دنیا میں اپنی رحمت عام کرنے ہی کے لیے اللہ نے اس ہستی کو مبعوث فرمایا، ورنہ کب کی یہ دنیا فنا کے گھاٹ اتر چکی ہوتی!

وہ اہلِ مکہ کے لیے رحمت تھا، جنہوں نے زندگی بھر کانٹے بچھائے، یہاں تک کہ اللہ رب العزت نے اسلام کی توفیق دے کر سب کو اپنی آغوشِ رحمت میں لے لیا۔

اہل طائف پر بھی وہ ابر کرم بن کر برسا، جنہوں نے اس کے مبارک قدموں کو پتھروں سے مار مار کر زخمی کیا تھا۔ رحمت کی یہ گھٹا اہلِ مدینہ پر یوں چھائی کہ ہمیشہ کے لیے وہاں کے باشندے دین کے انصار کہلائے، اور ان کا شہر ''مدینۃ النبی'' کہلایا، دو بڑے قبیلوں کی باہمی عداوت چشمِ زدن میں یوں غائب ہوئی کہ گویا کبھی اس کا وجود ہی نہ تھا۔

وہ سرزمین عرب کے لیے رحمت تھا جہاں کے باشندوں نے سوائے باہم لڑنے بھڑنے کے کچھ نہیں سیکھا تھا، اسی کی رحمت تھی کہ اونٹوں کے چرانے والوں نے تہذیب کی شمعیں روشن کیں، اور عالم کو ایک نیا عالمی نظام عطا کیا، جہاں انسان اور انسان کے درمیان کوئی تفریق نہ تھی۔

رحمت کی اس بارش سے روم وایران بھی محروم نہ رہے، جہاں اس کا کلمہ پڑھنے والوں کے

مبارک قدم پہنچے، تہذیب وتمدن کے نام پر جہاں قوموں کو پامال کیا جاتا تھا اور چند نفوس کی خوشی کے لیے لاکھوں انسانوں کو جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔

اس کی رحمت سے اہلِ ہند بھی سیراب ہوئے، جہاں اسی طائف کا ایک نمونہ پہنچا جو طائف اس عظیم شخص کی رحمت کی بنا پر محفوظ رہا، اور طائف کے اس فرزند نے ہندوستان والوں کو امن اور شانتی کا سبق پڑھایا، اسی کے حسنِ سلوک کو دیکھ کر اہلِ ہند اسے دیوتا قرار دینے لگے۔ اسپین کے عدیم المثال مدارس اس کی گواہی کے لیے کافی ہیں۔

وہ چین وجاپان کے لیے بھی رحمت بنا جہاں اس بابرکت ہستی کے ماننے والے پہنچے اور اپنے دیرپا نقوش ہمیشہ کے لیے ثبت کیے، وہ تہذیب و تمدن کے لیے رحمت تھا جس نے انسانوں کا خون چوسنے والی تہذیب اور ان کے کھنڈرات پر اپنے عشرت کدے تعمیر کرنے والے تمدن کے پرخچے اڑادیے، اور اس کی جگہ ایک ایسی تہذیب قائم کی جس کی بنیاد احترامِ آدمیت پر رکھی، جس نے کالے کلوٹے بلالِ حبشی کو کعبہ کی چھت پر کھڑا کر کے اذان دلائی، اور دنیا کو یہ پیغام دیا کہ رنگ ونسل کی زنجیریں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئیں، زندگی کے تمام شعبوں کے لیے وہ رحمت تھا، اخلاقی نظام کے لیے وہ اس طرح رحمت تھا کہ کل اخلاقی نظام اسی کا عطا کیا ہوا ہے، اس سے پہلے اخلاق کے نام پر دنیا کی تہذیبوں کے پاس سوائے بداخلاقی کے کچھ نہ تھا، اس کا اپنے متعلق یہ اعلان تھا: ”**إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ**“ (میں اچھے سے اچھے اخلاق کو کمال تک پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہوں)۔

تجارتی نظام کے لیے وہ رحمت تھا کہ اس نے اس نظام کو سود کی جکڑ بندیوں سے آزاد کیا، سودی لعنت میں پھنسی ہوئی گردنوں کو آزادی دلائی، فی الوقت دنیا جو معاشی گرداب میں پھنسی ہوئی ہے، وہ اس کی دی ہوئی رحمت کو نہ لینے کا نتیجہ ہے، وہ امیروں کے لیے رحمت تھا، اسی نے صدقہ و خیرات کی شاہراہیں کھول کر امیروں کو حرص وہوس سے بچایا، بلکہ پیسوں کی بندگی سے محفوظ رکھا، وہ غریبوں کے لیے رحمت تھا کہ زکوٰۃ وصدقات کے ذریعے ان کے آنسو پونچھے، عالی ہمتی وحوصلہ مندی کا راستہ دکھا کر خود بھی نہایت سادہ زندگی بسر کر کے اس نے غریب کو غیرت وخودداری کا سبق پڑھایا۔

وہ تعلیم وتعلّم کے لیے رحمت تھا کہ اس نے علم کا رشتہ اللہ سے جوڑا اور ہمیشہ کے لیے اس کا قبلہ درست کر دیا، ورنہ خدا فراموش ہو کر علم نہ جانے کیا کیا تماشہ دکھاتا۔ وہ اہلِ سیاست کے لیے رحمت تھا کہ اس نے سیاست وقیادت کے طریقے سمجھائے، اس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اقتدار انعام نہیں، امتحان ہے، اور اقتدار اپنے واسطے پانے کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کو نفع پہنچانے کے لیے ایک امانت کے طور پر ملتا ہے۔

وہ ماتحتوں کے لیے رحمت تھا کہ اس نے یہ اصول عطا فرمایا کہ حقوق اللہ سے چاہو، زندگی کا کون سا میدان ہے جہاں اس کی رحمت کا فیض نہ پہنچا ہو! اسی بنا پر وہ دنیا کا عظیم ترین انسان ہے، جس نے دنیا سے کچھ نہیں لیا، سب کچھ دنیا کو دے گیا: ”**قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ، إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ**“۔

☆☆☆

نماز کی روح

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

انسان کے ایمان کو اعلیٰ درجہ کا ہونے کے لیے بہترین ذریعہ نماز ہے، اسی لیے نماز سے پہلے طہارت کا خاص حکم بھی دیا گیا ہے، جس کے نتیجہ میں انسان کو صحابہ والی نماز میسر ہوتی ہے، اور سب سے اہم چیز جس سے انسان سب سے اعلیٰ مقام پاتا ہے وہ نماز ہے، اس لیے نماز کے لیے طہارت کا خاص اہتمام کرنے کو حکم دیا گیا، کیونکہ نماز کا دارومدار طہارت پر موقوف ہے، اسی لیے جب حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ سے درخواست کی تھی کہ صحابہ والی نماز پڑھنا چاہتا ہوں، تو سید صاحب نے فرمایا: پہلے آپ صحابہ والا وضو کیجیے، اس کے بعد نماز میں بھی وہی کیفیت حاصل ہوجائے گی، چنانچہ جب انہوں نے اسی کیفیت کے ساتھ وضو کیا تو خود فرماتے ہیں کہ حقیقی ایمان کی لذت محسوس ہورہی تھی، لہٰذا اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ہماری طہارت کمزور ہے تو نماز بھی کمزور ہوگی، اور یہی وجہ ہے کہ طہارت پہلے رکھی گئی ہے، تاکہ نماز اچھی ہوجائے، کیونکہ روحانیت کے میدان میں آگے بڑھنے کے لیے نماز کا مرتبہ بہت بلند ہے، اس لیے کہ اس کو مومنین کی معراج سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، لیکن اگر ہم سفر سے پہلے گاڑی میں تیل ہی نہ ڈالیں تو جس طرح گاڑی آگے نہیں چل سکتی، اسی طرح اگر ہم نماز سے پہلے اپنے ذہن ودماغ کو معطر اور پاک کر کے اللہ کے دربار میں حاضر نہ ہوں تو نماز کا مزا کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ ☆☆

تحریک ندوہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک لائق فخر فرزند

مولانا عبدالرزاق خان ملیح آبادیؒ

مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی (دہلی)

علمی دنیا میں اس طرح کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں کہ کسی شخصیت کی کوئی ایک نسبت اتنی مشہور ہوگئی کہ باقی نسبتیں گم ہو کر رہ گئیں۔ یہی معاملہ مولانا عبدالرزاق خان ملیح آبادی ندوی کا بھی ہے۔ علمی دنیا میں اُن کی شناخت ایک عظیم صحافی، مجاہد آزادی، مصنف، مترجم، تجزیہ نگار، انشا پرداز اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے ہم دم و ہم راز کی حیثیت سے قائم ہے۔ یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ ایک عالم دین اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے لائق فخر فرزند بھی تھے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اطرافِ لکھنؤ کی مشہور اور تاریخی بستی ملیح آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے اجداد قندھار، افغانستان سے ہندستان آئے تھے۔ والد جناب عبدالحمید خاں اور دادا جناب عبدالستار خاں اچھا ادبی و دینی ذوق رکھتے تھے۔ والد صاحب چہرے مہرے اور خاص کر داڑھی میں سرسید کے بہت مشابہ تھے۔ مولانا کا ننہال بھی پڑھا لکھا تھا۔ اُن کی والدہ محترمہ جوش ملیح آبادی کی چچا زاد بہن تھیں۔ ایسے خوش حال گھرانے میں ۱۸۹۸م کی کسی تاریخ کو مولانا کی ولادت ہوئی۔ چار سال کے ہوئے تو اپنے نانا نواب فقیر محمد خاں (گویا لکھنوی) کے اسکول میں داخل کرائے گئے۔ ابتدائی درجات میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی کتابوں سے مطالعے کا چسکا لگا۔ اسی کے نتیجے میں مڈل اسکول تک پہنچنے سے پہلے بوستانِ خیال، طلسم ہوش ربا اور فتوح الشام جیسی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ یہاں سے مولانا کا جو ذوق بنا وہی آخر تک ان کی رہنمائی کرتا رہا۔ ابتدائی درجات کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ۱۹۰۸ء میں ہائی اسکول میں داخلے کے لیے لکھنؤ شہر بھیجے گئے، لیکن اس درمیان اُن کی والدہ محترمہ کا مرضِ وفات شروع ہوگیا، اس لیے وہ واپس ملیح آباد آگئے۔ والدہ کی وفات کے بعد جب اُن کے والد محترم دوبارہ اُن کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو اُنھیں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کرایا۔ اُن کے والد محترم کے ارباب ندوہ اور بالخصوص علامہ شبلی نعمانی سے پرانے روابط تھے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ۱۹۰۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کی پہلی جماعت میں داخل ہوئے تھے۔ اُنھیں یہاں بھی درسیات سے بہت کم مناسبت رہی۔ زیادہ توجہ غیر درسی مطالعے پر تھی۔ وہ رات ڈیڑھ دو بجے تک مطالعے میں غرق رہتے۔ اُس زمانے میں علمی دنیا کے افق پر شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کا نام نیر تاباں کی طرح چمک رہا تھا۔ نوعمر عبدالرزاق خان نے علامہ شبلی کی تصانیف بھی پڑھ ڈالیں۔ خاص طور پر شبلی کی بے نظیر تصنیف الفاروق کو اتنی مرتبہ پڑھا کہ اس کا بڑا حصہ اُن کے حافظے میں قید ہوگیا۔ الفاروق سے اُن کے عشق کی وجہ سے اُن کے دوست احباب اُنھیں ''حافظِ الفاروق'' کہنے لگے تھے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ الفاروق سے اس شدید لگاؤ کے نتیجے میں اُن کے اندر اعلیٰ دینی حمیت اور باطل سے ٹکرانے کا جذبہ بھی پیدا ہوا اور اُن کی نثر میں وہ متانت بھی پیدا ہوئی جو ان کی نثر کی اہم خصوصیت ہے۔

۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء کے ربع اول کا سب سے یادگار اجلاس کا انعقاد ہوا۔ اس اجلاس میں علامہ رشید رضا مصری کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ وہی مشہور سفر ہے جس میں وہ اجلاس ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد دیوبند بھی گئے تھے اور علم حدیث کے حوالے سے ہندستانی محدثین کا اعتراف کیا تھا۔ وہ اُن دنوں **دارالدعوۃ والإرشاد** کے نام سے مصر میں جدید طرز کا ایک دینی ادارہ قائم کر رہے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شرکت کے لیے علامہ شبلی نعمانی کی دعوت فوراً قبول کرلی تھی، تاکہ ندوے کے نظام و نصاب کو قریب سے دیکھ سکیں۔ علامہ رشید رضا کو دیکھ اور سن کر دوسرے طلبہ کی طرح مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی بھی رشید رضا سے بہت متاثر ہوئے۔ اس لیے اُنھوں نے مصر میں تعلیم حاصل کرنے کا عزم کیا۔ آخر کار ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی نعمانی کے سفارشی خط کے ساتھ وہ مصر پہنچ گئے۔ مشہور فلسطینی رہنما مفتی امین حسینی وہاں اُن کے رفیق درس تھے۔ رشید رضا اپنے ہندستانی شاگرد پر بہت توجہ دیتے تھے۔ پیار سے **الهندی الأفندی** کہہ کر بلاتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ عبدالرزاق ملیح آبادی کا پہلا عربی مضمون ۱۹۱۴ء میں المنار میں اُسی شخصیت کی رحلت پر شائع ہوا جس شخصیت کا سفارشی خط لے کر وہ مصر پہنچے تھے، یعنی علامہ شبلی نعمانی۔ ایک تو علامہ رشید رضا کا نیا ادارہ مستحکم نہیں ہو پا رہا تھا، دوسرے عبدالرزاق خان کی شخصیت میں خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ شدید تھا، اس لیے وہ

چھٹیوں میں قسطنطنیہ کی سیاحت پر چلے گئے۔ وہاں جاکر اُنھیں تہذیب وثقافت اور انقلاب و بغاوت کہ ایک دوسری دنیا نظر آئی۔ انھوں نے بڑی محنت کر کے اُس وقت عالم اسلام کے ہیرو انور پاشا سے ملاقات کی اور خلافت عثمانیہ کے لیے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت چاہی، لیکن انور پاشا نے انھیں تعلیم مکمل کرنے کی نصیحت کی۔ اسی قسطنطنیہ سے عبدالرزاق ملیح آبادی کی صحافت کا سفر بھی شروع ہوا۔ اُنھیں وہاں سے نکلنے والے ایک سہ لسانی رسالے جہانِ اسلام کے اردو حصے کی ادارت سپرد کی گئی۔ انھوں نے کچھ عرصے یہ فرائض نبھائے۔ اپنی انقلابی تحریروں اور مجلسوں کی وجہ سے وہ برطانیہ کی نظر میں آگئے تھے، جس کی وجہ سے وہاں انھیں مصائب کا سامنا کرنا پڑا، لہٰذا وہ مصر واپس چلے گئے۔عربی زبان پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ انھوں وہاں فرانسیسی اور لاطینی زبانیں بھی سیکھیں۔مصر میں چار سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ حج کے لیے گئے۔ انگریزی استعمار مخالف خیالات کی وجہ سے وہاں گرفتار کر لیے گئے۔ یہ تقریباً وہی زمانہ ہے جس میں حجاز مقدس سے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کو گرفتار کر کے مالٹا بھیجا گیا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال جیل کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد بمشکل رہائی عمل میں آئی اور وہ ۱۹۱۸م میں ہندستان واپس ہوئے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو مصر کے قیام کے دوران عالم اسلام کو اچھی طرح سمجھنے، بڑے مسلم رہنماؤں سے مستفید ہونے، مسلم دنیا کے خلاف ہونے والی سازشوں کو قریب سے سمجھنے اور مختلف اقوام وملل کے لوگوں سے ملنے جلنے کا بھرپور موقع ملا۔ اُس دور میں برصغیر کے اہل علم میں یہ موقع شاید ہی کسی اور کو ملا ہوگا۔ اس کے باوجود انھیں اس بات کا احساس تھا کہ وہ علم حدیث پوری طرح حاصل نہیں کر سکے۔ اس لیے انھوں نے دوبارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لے لیا۔دو سال دارالاقامہ میں رہ کر صرف حدیث پر توجہ دی۔ اساتذہ سے پڑھنے کے علاوہ ذاتی مطالعے میں مسند احمد کے بڑے حصے کا مطالعہ کرلیا،لیکن اس درمیان وہ اپنے سینے میں بھڑکنے والی انقلابی آگ کو نہ دبا سکے۔اُن دنوں وہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی انقلابی تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے۔حسرت موہانی بھی آئے دن اُن کے پاس آتے تھے۔انگریزوں نے ندوے کی نگرانی شروع کردی۔اس لیے مولانا نے دارالاقامہ چھوڑ دیا اور باہر رہ کر تعلیم مکمل کی۔اس درمیان مولانا نے علی برادران سے مل کر اُن کے سامنے علماء کی ایک متحدہ تنظیم کا مکمل خاکہ بھی پیش کیا تھا۔ اسی طرح امارتِ ہند کا منصوبہ بھی تیار کیا۔یہی وجہ سے کہ بہت سے اہل علم اُن کو جمعیۃ علماء ہند اور امارت شرعیہ ہندیہ کا اولین نظریہ ساز مانتے ہیں۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تقسیم ہند سے پہلے کی زندگی پوری طرح جدوجہدِ آزادی سے عبارت ہے۔ندوے سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُنھوں نے مشہور عربی رسالے البیان لکھنؤ کی ادارت سنبھالی۔ الرشاد کے نام سے ایک چھاپہ خانہ شروع کیا۔تحریک خلافت میں سرگرم رہے۔ اس کے بعد کلکتہ جا کر ہفت روزہ پیغام کے مدیر ہوئے۔یہیں سے اُنھیں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت حاصل ہوئی۔ پھر یہ رفاقت ہی اُن کی شناخت بن گئی۔ انگریزی استعمار کے خلاف اُن کے اداریوں نے انگریزوں کو خوف زدہ کردیا۔اس لیے ۱۹۲۱ء میں اُنھیں جیل بھیج دیا گیا۔جیل میں سبھاش چندر بوس اور بعد میں مولانا ابو الکلام آزاد بھی ساتھ رہے۔ دو سال بعد ۱۹۲۳ء میں رہائی ملی تو انھوں نے خلافت عثمانیہ کی حمایت میں پندرہ روزہ عربی رسالہ الجامعۃ نکالنا شروع کیا۔۱۹۲۷ء میں روزنامہ پیام شروع کیا۔ یہ دونوں رسالے انگریزی عتاب کی نذر ہوگئے تو ۱۹۲۷ء میں الہلال کو دوبارہ شروع کردیا۔اسے بھی بند کردیا گیا تو ۱۹۳۰ء میں ہفت روزہ پیام اور ۱۹۳۱ء میں روزنامہ ہند جاری کیا۔ انگریزی حکومت کو دھوکا دینے کے لیے روزنامہ ہند کو کبھی الہند، کبھی ہفت روزہ ہند، کبھی روزنامہ ہند جدید اور کبھی سہ روزہ ہند کے نام سے شائع کرتے رہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہفت روزہ اجالا اور ۱۹۴۸ء میں آزاد ہند جاری کیا۔۱۹۴۹ء میں مولانا آزاد نے اُنھیں دلّی بلا لیا اور عربی مجلہ ثقافۃ الہند جاری کرایا۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے دلّی ہی سے ماہ نامہ سوغات بھی جاری کردیا۔ اس پورے صحافتی سلسلے سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی انقلابی سوچ، اندرونی تڑپ، جرأت وبے باکی، علمیت اور قلم کی روانی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے تصنیف و تالیف اور ترجمہ نگاری کی طرف بھی خصوصی توجہ کی۔آزادی کی جدوجہد اور صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ انھوں نے مطالعہ بھی جاری رکھا اور تصنیف و ترجمہ بھی۔ڈاکٹر سنجر بھارتی نے ان کی چھوٹی بڑی تصانیف وتراجم کی فہرست ترتیب دی ہے۔اُس میں ۶۴ رکتابیں ہیں۔علامہ ابن تیمیہ کی متعدد تصانیف بالخصوص اقتضاء الصراط المستقیم، الوسیلۃ، أصحاب الصفۃ کے ترجمے اور علامہ ابن قیم کی زادالمعاد کی تلخیص وترجمہ اور علامہ ابن

عبدالبر کی جامع بیان العلم وفضلہ کا ترجمہ بہت مشہور ہوئے۔ مولانا نے کچھ ناولوں کے ترجمے بھی کیے۔ اُنھیں سیرت رسول سے بھی بہت مناسبت تھی۔ اس ذیل میں اُن کی تصنیف ’رحلتِ مصطفیٰ‘ منظر عام پر آئی۔ وہ قرآن کریم کی روشنی میں سیرت نبوی لکھنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے، لیکن اس ارادے کو پورا نہیں کر سکے۔ یہ بات بھی تقریباً طے ہے کہ ’انسانیت موت کے دروازے پر‘ بھی مولانا ملیح آبادی کی تصنیف ہے، جسے ناشر نے مولانا آزاد کی طرف منسوب کر دیا۔ ’ذکر آزاد‘ اور ’مولانا ابوالکلام آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی‘ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی مقبولِ عام تصانیف ہیں۔ ان کتابوں میں مولانا ملیح آبادی کا مولانا آزاد سے تعلق اور مولانا ملیح آبادی کی اردو نثر کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ہمارا احساس ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے دست راست بننے سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو جو فوائد حاصل ہوئے وہ تو ہوئے ہی، ایک بڑا نقصان بھی ہوا۔ اُن کی شخصیت مولانا آزاد کا ضمیمہ بن کر رہ گئی۔ اُن کی شخصیت کی انفرادیت اسی کو سمجھ لیا گیا کہ وہ امام الہند کے ہم دم و ہم راز تھے۔ اُن کی اصل صلاحیتوں کو جاننے اور ان سے مستفید ہونے کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔

۱۹۵۴ء میں میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی پر سرطان کا حملہ ہوا۔ علاج کے بعد وہ پھر اپنی علمی مصروفیات میں لگ گئے، لیکن ۱۹۵۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات نے اُنھیں توڑ کر رکھ دیا۔ بالکل بجھ سے گئے۔ کہتے تھے کہ ”مولانا کے بعد زندگی میں کوئی لطف نہ رہا۔ اب میں بچوں گا نہیں۔ میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ انگریز بھی چلا گیا اور ملک کو آزادی بھی مل گئی۔ گواہ رہنا کہ میں زندگی بھر انگریز کا دشمن رہا۔“ آخر کار ۲۴؍جون ۱۹۵۹ء کو ٹاٹا اسپتال، بمبئی میں وفات پائی۔ دو روز بعد ملیح آباد میں اپنے نانا کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے۔ مولانا کی زندگی میں ہمارے لیے بہت سے اسباق ہیں۔ ہمیں ان سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔

☆☆☆

بقیہ: تذکرہ شاہ ولی اللہ

ماہنامہ الفرقان کے حضرت شاہ ولی اللہ نمبر کی اشاعت کے بعد برصغیر ہند و پاک میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت، خدمات اور علمی کاموں کے بارے میں متعدد تصانیف اور تحریریں شائع ہوئیں، جن میں سب سے اہم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ دعوت وعزیمت کا وہ حصہ ہے جو پورے کا پورا حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ہمہ جہت خدمات کا تعارف کراتا ہے، لیکن اس کے باوجود حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”الفرقان“ شاہ ولی اللہ نمبر جلد دوم کا جو خاکہ اپنی مذکورہ بالا تحریر میں پیش کیا ہے اس پر کام کئے جانے کی ضرورت ہے، اگر حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے اصل مقالہ کا مسودہ دستیاب ہو جائے تو اس کام میں سہولت ہوگی، اور حضرت مرحوم کی ایک اہم تحریر بھی منظر عام پر آجائے گی، لیکن خدانخواستہ اگر وہ قیمتی مسودہ دستیاب نہ ہو تب بھی اس کام کو ہونا چاہئے، ان شاء اللہ اس سے موجودہ حالات میں امت مسلمہ کو بہت فائدہ ہوگا، مدیر الفرقان حضرت مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی اس جانب توجہ فرما سکیں تو بہت بہتر ہو، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم وافکار ان کا خصوصی موضوع رہے ہیں، لیکن خدانخواستہ اگر وہ اپنی مصروفیات اور امراض کی وجہ سے اس کی ہمت نہ کر سکیں تو میری ان کے برادر اکبر حضرت مولانا محمد حسان نعمانی ندوی زید مجدہم سے گذارش ہے کہ وہ اس کام کے لئے ہمت جٹالیں، ان شاء اللہ اللہ تعالی اسے پورا کرائے گا، الحمد للہ انہوں نے خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ بہت سے علمی کام کئے ہیں، خود الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر کی جدید اور دیدہ زیب اشاعت ان کی مخلصانہ کوششوں کا عظیم ثمرہ ہے، ان کے پیش لفظ سے یہ جان کر حیرت و مسرت ہوئی کہ انھوں نے تذکرہ شاہ ولی اللہ (یعنی ماہنامہ الفرقان کا خاص نمبر) کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، ترمیم واصلاح کا کام خود ہی انجام دیا ہے۔

تمام اہل علم ”تذکرہ شاہ ولی اللہ“ کی اس جدید اشاعت پر الفرقان بکڈ پو لکھنؤ اور اس کے ناظم و مالک حضرت مولانا حسان نعمانی ندوی دامت برکاتہم کے شکر گزار ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر جلد دوم جو ان کے والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کا منصوبہ اور خواب تھا ان کے ذریعہ ان شاء اللہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔

مجھے امید ہے کہ ہندوستان کی علمی اور دینی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے خاص طور سے خانوادۂ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ وخدمات سے دلچسپی رکھنے والے علماء، طلباء اور اصحاب بحث وتحقیق تذکرۂ شاہ ولی اللہ کو جلد سے جلد حاصل کریں گے اور اسے اپنی لائبریری کی زینت بنائیں گے، کیوں کہ اس اشاعت کے ختم ہونے کے بعد اگلی اشاعت کب تک ہو یہ معلوم نہیں ہے، اللہ تعالی موجودہ بحرانی اور پریشان کن حالات میں اس کتاب کو امت اسلامیہ ہندیہ کے لئے رہنما بنائے، اور اس کتاب کی روشنی میں اصلاح وتجدید تعلیم وتحقیق کے میدانوں میں کچھ اقدامات کئے جا سکیں۔

☆☆☆

فکرونظر

انحصار سے خود مختاری کی طرف

مولانا محمد وثیق ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

اس وقت پوری دنیا ایک نازک اور فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہی ہے، بالخصوص مشرقِ وسطیٰ ایسے سنگین بحران سے دوچار ہے جس کے اثرات محض چند ممالک یا ایک خطے تک محدود نہیں رہیں گے، بلکہ عالمی سیاست، معیشت، توانائی اور بین الاقوامی تعلقات کے پورے نظام کو متاثر کر سکتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ واسرائیل اور ایران کے درمیان جاری جنگ نے خطے کے امن و استحکام کو شدید خطرات سے دوچار کر دیا ہے اور شدت سے یہ سوال کیا جارہا ہے کہ کیا وہ قومیں جو اپنی سلامتی، معیشت اور دفاع کے لیے دوسروں پر غیر معمولی انحصار کرتی ہیں، واقعی اپنی آزادی اور خودمختاری کی حفاظت کرسکتی ہیں؟ خلیجی ممالک پر ڈرونز، بیلسٹک میزائلوں، بمبار جہازوں اور دیگر فوجی ذرائع سے ہونے والے حملوں نے بنیادی ڈھانچے، تیل صاف کرنے کے مراکز، گیس تنصیبات، شمسی توانائی کے منصوبوں اور دیگر اہم مراکز کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ بندرگاہوں، ہوائی اڈوں اور شہری خدمات کے مراکز کو نشانہ بنائے جانے سے خطرے کی نوعیت مزید واضح ہو گئی ہے۔ یہ محض محدود فوجی کارروائیاں نہیں، بلکہ ان کے پسِ پشت وسیع تر تزویراتی اہداف بھی کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ صورتِ حال سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ امریکہ یا تو عرب ملکوں کو دھوکا دینے میں کامیاب رہا ہے یا پھر ان کے دفاع سے عاجز آچکا ہے، ایک زمانے میں امریکہ ملکوں اور قوموں کو دھمکی دیتا تھا کہ اگر انھوں نے اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا تو انھیں بھیانک انجام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امریکی صدر یہ دعویٰ بھی کیا کرتے تھے کہ امریکہ بیک وقت سات سے زیادہ ممالک سے جنگ لڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے پاس ایسی فوجی طاقت موجود ہے جو اس اقدام کے لیے کافی ہے۔ تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امریکی قیادت اپنی جدید عسکری طاقت اور اس اعتماد کے نشے میں مبتلا تھی کہ کوئی اس کا مقابلہ کرنے اور اس کے سامنے مزاحمت کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن موجودہ جنگ نے اس خود اعتمادی کے پردے کو چاک کر دیا ہے، اس نے امریکہ کی کمزوری اور اس کے ان عزائم کی ناکامی کو نمایاں کر دیا ہے جن کے ذریعے وہ ایران میں رجیم چینج کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ امریکہ کے موقف میں کمزوری، تذبذب اور پسپائی کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں۔ بالخصوص عرب ممالک کے دفاع کے معاملے میں اس کی بے بسی آشکارا ہو چکی ہے؛ حالاں کہ یہی ممالک امریکہ کو کروڑوں ڈالر ادا کرتے رہے، اس سے جدید ترین اسلحہ خریدتے رہے اور اپنی سرزمین پر امریکی فوجی اڈوں کے قیام کے لیے جگہ فراہم کرتے رہے۔ موجودہ جنگ نے عرب ممالک کے دفاعی نظام، راڈار سسٹم اور خفیہ اطلاعات کے پورے ڈھانچے کی کمزوری اور ناکامی کو بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ چنانچہ حملوں کا سلسلہ جاری ہے، جانی و مالی نقصانات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، املاک اور بنیادی ڈھانچے کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے اور عالمی معیشت بھی تباہی کے خطرے سے دوچار ہوتی جارہی ہے؛ خصوصاً اس وقت جب آبنائے ہرمز کی ناکہ بندی یا اس سے گزرنے والے تجارتی جہازوں کو تباہ کرنے کی دھمکیاں دی جارہی ہیں۔

عالمی ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کے مطابق خلیجی ممالک کے امن واستحکام کو متزلزل کرنے، عرب و اسلامی دنیا میں تنازعات کو ہوا دینے اور وہاں بدامنی وانتشار پھیلانے کے لیے مغربی اور اسرائیلی منصوبہ بندی کے شواہد سامنے آرہے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک اس جنگ کو اپنے وجود کے لیے ایک خطرہ تصور کر رہے ہیں۔ خطے کو نشانہ بنائے جانے کا تعلق محض اس کے جغرافیائی محلِ وقوع سے نہیں، بلکہ اس حیثیت سے بھی ہے کہ وہ عالمی توانائی کا ایک بنیادی مرکز اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک نہایت اہم تجارتی گزرگاہ اور سپلائی چین ہے۔ بین الاقوامی سیاسی مبصرین اور جغرافیۂ سیاسی کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ان تمام حالات سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ امریکہ کمزوری اور پسپائی کی حالت سے دوچار ہے اور وہ اپنی عالمی حیثیت و قوت بتدریج کھو رہا ہے۔ لہٰذا جو ممالک امریکہ پر تکیہ کیے ہوئے ہیں، انھیں اپنی امریکی پالیسی پر ازسرِنو غور کرنا چاہیے، خطے کی موجودہ صورتِ حال عرب ملکوں کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنی پالیسیوں کی ازسرِنو تشکیل کریں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں خودمختاری اور خودکفالت کی راہ اختیار کریں۔

مغرب کے ساتھ تلخ تجربات کا تقاضا ہے کہ عرب و اسلامی دنیا کے حکم ران اپنے مسائل اور بحرانوں کے حقیقی اسباب کو پہچانیں اور ایک باشعور اور دانشمندانہ موقف اختیار کریں، ایسا موقف جو فکری بصیرت اور اصالت پر قائم ہو، نہ کہ نری نقالی، تقلید اور ان قوتوں کی تابع داری پر جنہوں نے ان کے مسائل اور مصائب میں اضافہ کیا ہے۔

المیہ یہ ہے کہ عرب ممالک کے پاس نہ کوئی متحدہ عسکری قوت ہے، نہ اپنی جنگی صنعت، نہ خاطر خواہ مقامی دفاعی پیداوار، حالاں کہ ان کے پاس اس مقصد کی صلاحیت اور وسائل دونوں موجود ہیں۔ ان کے پاس بے پناہ معدنی ذخائر، تیل و گیس کے وسیع چشمے، اہم آبی گزرگاہیں اور عالمی سیاست میں غیر معمولی تزویراتی اہمیت رکھنے والے جغرافیائی مقامات موجود ہیں؛ لیکن اس کے باوجود انہوں نے خودمختاری اور اپنی داخلی قوتوں پر اعتماد کے بجائے ان طاقتوں کی پیروی اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا راستہ اختیار کیا ہے جو ان کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتی ہیں اور انہیں اپنی زندگی، ترقی اور قوت کے حقیقی سرچشموں سے استفادہ کرنے سے روکتی ہیں۔

خطے کے موجودہ حالات اور فوجی کارروائیوں کے پس منظر میں اب ایک مشترکہ اسلامی فوج اور مشترکہ دفاعی نظام کے قیام کی آوازیں بھی بلند ہونے لگی ہیں۔ قطر کے سابق وزیر اعظم اور سابق وزیر خارجہ حمد بن جاسم بن جبر آل ثانی نے خلیجی تعاون کونسل کے ممالک سے فوری اقدام کرتے ہوئے ایک مشترکہ دفاعی ڈھانچا قائم کرنے کی اپیل کی ہے، جو اجتماعی سلامتی کو مضبوط بنائے اور خطے کو درپیش موجودہ چیلنجوں کا مقابلہ کر سکے۔ حمد بن جاسم نے سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر اپنے سرکاری اکاؤنٹ کے ذریعے کہا کہ ایک مضبوط خلیجی دفاعی فوجی اتحاد کا قیام اب ناگزیر ضرورت بن چکا ہے، جو عالمی سطح کے بڑے دفاعی اتحادوں، بالخصوص "نیٹو" کی طرز پر خلیجی ممالک کے مشترکہ دفاع اور سلامتی کو یقینی بنا سکے۔ ان کے مطابق اس اقدام کا مقصد خلیجی ممالک کے مفادات کا تحفظ، ان کی دفاعی صلاحیتوں کو مستحکم کرنا اور مستقبل میں کسی بھی ممکنہ خطرے کا مؤثر مقابلہ کرنا ہے۔ انہوں نے اس امر پر بھی زور دیا کہ موجودہ عسکری بحران کو محض ایک تباہ کن واقعے کے طور پر نہیں، بلکہ اس سے اہم تزویراتی سبق لینے کے ایک موقع کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ سب سے اہم سبق خلیجی ممالک کے مابین اتحاد، داخلی اختلافات سے بالاتر ہو کر مشترکہ مفادات کو ترجیح دینا اور خطے کے استحکام کے لیے اجتماعی حکمتِ عملی اختیار کرنا ہے۔ حمد بن جاسم نے ترکی اور پاکستان جیسے ممالک کے ساتھ تزویراتی شراکت داری کو مزید مستحکم کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا، تاہم اس کے ساتھ یہ بنیادی نکتہ واضح کیا کہ خلیجی ممالک کو اپنے مشترکہ دفاعی نظام کی تعمیر میں سب سے بڑھ کر اپنی داخلی صلاحیتوں، اپنے وسائل اور اپنی قوتِ بازو پر اعتماد کرنا ہوگا۔ یہی وہ راستہ ہے، جو وابستگی اور انحصار سے خوداعتمادی، اور دوسروں کے سہارے سے خودمختاری کی طرف لے جاتا ہے۔ موجودہ بحران شاید عرب و اسلامی دنیا کے لیے یہ فیصلہ کن سبق لے کر آیا ہے کہ قومی سلامتی، سیاسی خودمختاری اور اجتماعی بقا کا حقیقی تحفظ دوسروں کے وعدوں سے نہیں، بلکہ اپنی قوت، اپنے اتحاد، اپنی صلاحیت، اپنے وسائل پر اعتماد اور پورے طور پر آزاد اور خودکفیل ہونے سے ممکن ہے۔

حالیہ دنوں میں سعودی عرب، ترکیہ اور پاکستان کے درمیان "مکہ مشترکہ دفاعی معاہدہ" کو اس سمت میں مفید پہل کے طور پر دیکھا جا رہا ہے، یہ ایک ایسا اقدام ہے جس کا مقصد دفاعی تعاون کو فروغ دینا اور اجتماعی روک تھام کے نظام کو مضبوط بنانا ہے، جس سے علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر امن و استحکام کو تقویت ملے۔ اس معاہدے پر دستخط ۷/اگست ۲۰۲۶ء بروز جمعہ "مکہ مکرمہ مشترکہ دفاعی سربراہی اجلاس" کے دوران ہوئے، اجلاس میں تینوں ممالک کے رہنما (ترکی کے صدر رجب طیب اردوان، سعودی ولی عہد و وزیر اعظم شہزادہ محمد بن سلمان اور پاکستان کے وزیر اعظم شہباز شریف) شریک ہوئے۔ مشترکہ اعلامیہ کے مطابق "معاہدہ تینوں ممالک کے گہرے تاریخی تعلقات، دیرینہ برادرانہ روابط، اسلامی یکجہتی، مشترکہ تزویراتی مفادات اور مضبوط دفاعی تعاون کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا ہے"۔ مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ "تینوں ممالک اس بات پر متفق ہیں کہ کسی بھی ایک ریاست کے خلاف مسلح حملے کو تینوں ریاستوں کے خلاف حملہ تصور کیا جائے گا"۔ اعلامیے کے مطابق "اس معاہدے کا مقصد کسی بھی جارحیت کے خلاف مشترکہ دفاعی صلاحیت کو مضبوط بنانا، عسکری تعاون کو وسعت دینا اور خطے میں امن، سلامتی اور استحکام کو فروغ دینا ہے"۔

"باہمی یکجہتی"، "آپس ی تعاون" اور "اتحاد" ملتِ اسلامیہ کا نمایاں وصف رہا ہے، اسی اتحاد و یکجہتی کی بدولت مسلمانوں نے دشمنوں پر غلبہ حاصل کیا، مختلف جنگوں، بالخصوص صلیبی جنگوں کا مقابلہ کیا، خود ان کے دشمنوں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ مسلمان خواہ کتنے ہی باہم منتشر کیوں

نہ ہوں، جب کوئی دشمن ان پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ متحد و یکجا ہو جاتے ہیں، ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور ان کے باہمی اختلافات پسِ پشت چلے جاتے ہیں۔ یہی اتحاد و یکجہتی صلیبی جنگوں میں صلیبی طاقتوں کی شکست کا ایک بنیادی راز تھا۔

لیکن یہ مقصد خود انحصاری و خود مختاری کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور خود مختاری کی طرف واپسی تعلیم و تربیت کے مؤثر نظام کے ذریعہ ہی ممکن ہے، جب تک یہ دونوں شعبے ایسے مخلص اور باوفا افراد کے ہاتھوں میں منتقل نہیں ہو جاتے جو عرب و اسلامی دنیا کے حقیقی مفادات کے وفادار ہوں، مسلم دنیا کی موجودہ صورتِ حال میں کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ نے اپنے ایک مضمون میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’اسی لیے مغربی دنیا اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ تعلیم اور تربیت کے یہ دونوں ذرائع انہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہیں جو اس کے ساتھ تعاون کرتے ہوں، اس کے فرامین اور خواہشات کو نافذ کرتے ہوں اور اس کے مفادات کی خدمت کرتے ہوں۔ یہ تبدیلی صرف نفوس کی تربیت، اس کے لیے اندرونی اور عوامی سطح پر ایک سازگار ماحول پیدا کرنے، صبر و حکمت، غور و فکر اور باہمی اتحاد کے ذریعے ہی ممکن ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام چیزوں سے اجتناب کیا جائے جو اسلامی امت کو منتشر اور اس کی شیرازہ بندی کو پارہ پارہ کرتی ہیں‘‘۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عرب ممالک اپنی تجارت، مالیاتی نظام، صنعتی پیداوار اور دفاعی ساز و سامان کی تیاری میں آزاد اور خود کفیل ہوں اور اپنی بنیادی ضروریات کے لیے دوسروں کے محتاج نہ رہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اسی خود مختاری کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے:

’’عالم اسلامی کی طرح عالم عربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تجارت، مالیات، صنعت و حرفت اور تعلیم میں پورے طور پر آزاد اور خود کفیل ہو، وہاں کے رہنے والے انہیں چیزوں کا استعمال کریں جو ان کی زمین کی پیداوار اور ان کی صنعت و محنت کا نتیجہ ہوں، زندگی کے ہر شعبہ میں وہ مغرب سے مستغنی ہوں، اپنی تمام ضروریات، مصنوعات، غذا، لباس، ہتھیار، مشینیں، آلات حرب کسی چیز میں وہ غیر کے دست نگر اور مغرب کے پروردۂ رحمت اور نمک خوار نہ ہوں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ عالم عربی اگر بعض ناگزیر حالات کی بنا پر مغرب سے جنگ کرنا چاہے تو وہ اس لیے جنگ نہیں کر سکتا کہ وہ اس کا مقروض اور اس کی امداد کا محتاج ہے، جس قلم سے وہ مغرب کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کرتا ہے، وہ قلم بھی مغرب ہی کا بنا ہوا ہے، اگر وہ مقابلہ کرتا ہے تو میدان جنگ میں اسی گولی کا استعمال کرتا ہے جو مغرب کے کارخانہ کی تیار شدہ ہے، عالم عربی کے لیے یہ ایک بڑی ٹریجڈی ہے کہ وہ اپنے دولت کے ذخیروں اور قوت کے سرچشموں سے خود فائدہ نہ اٹھا سکے، زندگی کا خون اس کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اس کی رگوں سے دوسروں کے جسم میں پہنچتا ہو، اس کی فوجوں کی ٹریننگ مغرب کے ایجنٹ اور فوجی افسران کے ہاتھ میں ہو اور حکومت کے دوسرے شعبے بھی انہیں کے سپرد ہوں، عالم عربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ضروریات کا خود کفیل ہو، تجارت و مالیات کی تنظیم، درآمد برآمد، قومی صنعت، فوج کی ٹریننگ اور مشینوں اور آلات حرب کی تیاری پر اس کا مکمل قبضہ ہو، ایسے اشخاص کی تربیت کی جائے جو حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں اور سرکاری فرائض پوری واقفیت، فنی مہارت و دیانت اور خیر خواہی کے ساتھ انجام دیں‘‘۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، صفحہ: ۳۱۵ و ۳۱۶)

☆☆☆

اسلامی میڈیا کا کام

مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہریؒ

اسلامی میڈیا مسائل و مشکلات سے باخبر کرنے کا نام ہے، نہ کہ ان کو الجھا کر تجارت کرنا، یہ حقیقت ہے کہ جو شخص بھی پیغام حق پہنچانا چاہتا ہے، اس کا مقصد تجارت نہیں ہے، وہ ہمیشہ اپنے پیغام کی رسائی کے نتائج پر نظر رکھتا ہے، وہ اپنی صدائے بازگشت سننے کا منتظر رہتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ اس پیغام کو کس حد تک رسائی ہوئی ہے، اس کے مطلوبہ نتائج کہاں تک حاصل ہوئے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کرتے وقت جو ہدایات فرمائی تھیں، ان میں ہر رہنمائی کے بعد اس کے نتائج اور ان کی نگرانی کا بھی حکم دیا تھا، پہلے ان یمنیوں سے یہ کہنا، جب وہ تمہاری بات مان لیں تو پھر یہ کہنا، اور یہ بھی مان لیں تو ان کے ساتھ یہ معاملہ کرنا، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ میڈیا کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مسائل و مشکلات سے تعرض کرنے کے بعد ردِ عمل دیکھے۔

محاسن اسلام

کیا عورت کو ناقص العقل کہنا اس کی تحقیر ہے؟

ایک علمی وتنقیدی جائزہ

مولانا منور سلطان ندوی (رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء)

فاطمہ مرنیسی مراکشی نژاد فیمینسٹ مفکرہ اور ایک درجن سے زائد کتابوں کی مصنفہ ہیں، ان کی کتابیں دنیا کی متعدد معروف زبانوں میں ترجمہ ہوکر شائع ہوچکی ہیں، ان کا بیشتر علمی سرمایہ اسلام، جنس اور خواتین کے حقوق کے گرد گھومتا ہے، مراکش میں انہوں نے خواتین کے لئے بڑا کام کیا ہے۔

ان کی ایک معروف کتاب The Veil and the Male Elite ہے، اصل کتاب فرانسیسی (Le Harem Politique) میں تھی۔ انگریزی، عربی، فارسی، اطالوی، ملیالم وغیرہ میں ترجمے ہوئے۔ کتاب کا مرکزی موضوع حدیث "لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة" ہے۔ مرنیسی نے خصوصاً حدیث کے راوی ابوبکرہؓ کی روایت کے تاریخی پس منظر پر تنقید کی ہے۔

اس کتاب میں خواتین سے متعلق ان احادیث اوران کی روایتی تعبیرات پر عمومی تنقید کی گئی ہے جنہیں (مصنفہ کے نزدیک) مسلم معاشروں میں عورت کی کمتر حیثیت ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اسی عمومی تناظر میں حدیث "ناقصات عقل ودین" کی روایتی تعبیر بھی ان کی تنقید کے دائرے میں آتی ہے۔

پاکستانی نژاد امریکی مصنفہ رفعت حسن مسلم فیمینسٹ مفکرین کی نمائندہ شخصیات میں سے ہیں، انہوں نے اسلام، انسانی حقوق، خواتین کے حقوق، قرآن کی تعبیر اور بین المذاہب مکالمے کے موضوعات پر اہم علمی خدمات انجام دی ہیں، Equal Before Allah انکی معروف کتاب ہے، اس میں وہ اس تصور پر تنقید کرتی ہیں کہ حدیث ناقصات عقل ودین کو عورت کی فطری کم تری کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ Women's and Men's Liberation نامی مقالہ میں انہوں نے ان روایات کو موضوع بنایا ہے جو ان کے نزدیک عورت کی مساوات کی راہ میں رکاوٹ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں، اسی طرح Are Human Rights Compatible with Islaman نامی مقالہ میں بھی انہوں نے اس طرح کی گفتگو ملتی ہے۔

فاطمہ مرنیسی اور ڈاکٹر رفعت حسن کا ذکر یہاں محض بطورِ مثال کیا گیا ہے۔ ان کی طرح متعدد دیگر معاصر مسلم نسائی مفکرین بھی ایسے افکار کی حامل ہیں۔ اگر چہ ان کے اسلوبِ استدلال، تعبیرات اور نتائج میں کسی حد تک اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم ان کے مرکزی موقف میں خاصی مماثلت نظر آتی ہے۔ بالعموم یہ مفکرین ان احادیث، فقہی آراء اور روایتی تعبیرات پر تنقید کرتی ہیں جنہیں وہ معاصر انسانی حقوق، صنفی مساوات اور جدید فکری تناظر میں قابلِ نظرِ ثانی سمجھتی ہیں۔ ذیل میں حدیثِ "ناقصات عقل ودین" کے حوالے سے پیش کیے جانے والے ان اہم اعتراضات کا علمی وتنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

جس حدیث کے حوالے گفتگو ہورہی ہے پہلی اس حدیث کو مکمل درج کرتے ہیں:

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے دن عیدگاہ کی طرف تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ عورتوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: اے عورتوں کی جماعت! صدقہ کرو، کیونکہ مجھے دکھایا گیا ہے کہ تم جہنم والوں میں سب سے زیادہ ہو۔ عورتوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایسا کیوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم کثرت سے لعنت کرتی ہو اور اپنے شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔ میں نے عقل اور دین میں کمی رکھنے والیوں میں تم سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا جو ایک سمجھ دار اور مضبوط ارادے والے مرد کی عقل پر اس قدر غالب آجائے۔ عورتوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارے دین اور عقل میں کمی کس طرح ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا عورت کی گواہی مرد کی گواہی کے نصف کے برابر نہیں؟ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اس کے عقل میں کمی کی ایک صورت ہے۔ اور کیا ایسا نہیں کہ جب عورت کو حیض آتا ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اس کے دین میں کمی کی ایک صورت ہے۔

معترضین کے بنیادی اعتراضات

۱- حدیث سے واضح ہوتا ہے عورت فطری طور پر کم عقل ہے؟ ناقدین کہتے ہیں کہ یہ عورت کی ذہانت کی توہین ہے۔

۲- یہ حدیث قرآن کے اصولِ مساوات (النساء:۱، الاحزاب:۳۵ وغیرہ) کے خلاف

معلوم ہوتی ہے۔

۳-عورت کی گواہی کو عقل کے نقص سے جوڑنا محلِ نظر ہے، کیونکہ گواہی ایک قانونی مسئلہ ہے، یہ ذہانت کا معیار نہیں ہے۔

۴-آج عورتیں سائنس، طب، قانون اور تعلیم میں مردوں کے برابر بلکہ بعض اوقات زیادہ کامیاب ہیں، لہٰذا حدیث کا مفہوم درست نہیں معلوم ہوتا۔

۵-حیض کے دوران نماز اور روزہ چھوڑنا اللہ کا حکم ہے، پھر اسے ''نقصِ دین'' کہنا کیوں؟

۶-یہ حدیث معاشرے میں عورت کی تحقیر اور امتیازی سلوک کا سبب بنی ہے۔

معترضین کے دلائل

معترضین نے عموماً ان آیات سے استدلال کیا ہے جن میں مرد و عورت کی انسانی قدر و منزلت کو برابر قرار دیا ہے۔ اسی طرح جزا و سزا میں مساوات اور علم حاصل کرنے کی ترغیب میں مساوات سے متعلق آیات سے استدلال کیا گیا ہے۔

ان کا استدلال اس سے بھی ہے کہ ہزاروں احادیث کی راویہ خواتین ہیں، متعدد صحابیات معلمہ تھیں۔ ازواج مطہرات کے علاوہ تاریخ کے ہر دور میں خواتین کی علمی اور تحقیقی خدمات مسلم رہی ہیں۔

ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ عقل کا تعلق دماغی صلاحیت سے ہے، گواہی سے نہیں۔ اگر دو عورتوں کی گواہی بعض معاملات میں معتبر ہے تو اسے عقل میں کمی کہنا درست نہیں۔ اسی طرح یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ جدید نفسیات میں مرد و عورت کے IQ میں کوئی قطعی فرق ثابت نہیں، ان کے علاوہ اور بھی دلائل ہیں۔

اعتراضات کا جائزہ

اعتراضات کے جواب سے پہلے چند اصول باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

پہلی بات: جس حدیث پر اعتراض کیا جاتا ہے، وہ فنی و حدیثی اعتبار سے صحیح ثابت ہو تو سب سے پہلے اس کے بارے میں دل و ذہن کو مطمئن ہونا چاہیے کہ یہ واقعی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ بنیادی دینی تقاضا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے صحیح طور پر ثابت شدہ ارشاد کے بارے میں بدگمانی کے بجائے اسے قبولِ حق کے جذبے کے ساتھ دیکھے، کیونکہ آپ ﷺ کی سنت وحیِ الٰہی کی رہنمائی میں قائم ہے۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ اس حدیث کی صحیح تفہیم، اس کے سیاق و سباق، الفاظ کے مفہوم اور اہلِ علم کی تشریحات کی روشنی میں اس کی درست تعبیر کا ہے۔

دوسری اصولی بات یہ ہے کہ پوری اسلامی تعلیمات اس بات کی گواہ ہیں کہ اسلام نے دیگر مذاہب و معاشروں کے مقابلے میں عورت کو نہ صرف عزت و تکریم عطا کی، بلکہ اس کی فطری خصوصیات، صلاحیتوں اور ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے حقوق اور دائرۂ کار بھی متعین کیے ہیں۔ جس دین نے ابتدا ہی سے عورت کی تکریم، اس کے انسانی وقار اور اس کے حقوق کو تسلیم کیا ہو، اس کی بنیادی تعلیمات کی روشنی میں عورت کی تحقیر و تذلیل کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اگر کسی آیت یا حدیث کے بظاہر الفاظ سے ایسا مفہوم سامنے آتا ہو جو اسلامی تعلیمات کے اس مجموعی تصور سے متعارض محسوس ہوتا ہے، تو اسے شریعت کے بنیادی اصولوں، نصوص کے باہمی ربط، سیاق و سباق اور اہلِ علم کی تشریحات کی روشنی میں سمجھا جائے گا، اور اس کی درست اور مناسب تعبیر و تشریح کی جائے گی۔

تیسری بات: احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کا موقع تھا، رسول اللہ ﷺ خطاب فرما رہے تھے اور صحابیات بھی موجود تھیں۔ ایسے موقع پر آپ ﷺ کے خلقِ عظیم، شفقت اور خیر خواہی کے پیشِ نظر یہ مفروضہ درست نہیں کہ اس ارشاد کا مقصد عورتوں کی تحقیر تھا، خود حدیث کا سیاق بھی تنبیہ، نصیحت اور تعلیم پر دلالت کرتا ہے۔

جب صحابیات نے سوال کیا: وَمَا نُقْصَانُ دِينِنَا وَعَقْلِنَا يَا رَسُولَ اللهِ؟ تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مفہوم کی وضاحت چاہتی تھیں، اور آپ ﷺ نے اس کی تفصیل بیان فرمائی، اس مکالمہ میں کہیں کوئی اشارہ اس اس بات کا نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سننے والی صحابیات کو ناگوار گزرا۔

لہٰذا حدیث کو عورت کی تحقیر کے بجائے اس کی بعض فطری خصوصیات اور ان سے متعلق شرعی احکام کی وضاحت کے تناظر میں سمجھنا زیادہ درست ہے۔

حدیث کے اسلوب میں ایک لطیف پہلو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ گویا عورتوں کی فطرت کے اس پہلو پر تعجب کا اظہار فرما رہے ہیں کہ ایک طرف عورت بعض فطری عوارض کے باعث بعض عبادات کے کمال سے عارضی طور پر محروم ہوتی ہیں، تو دوسری طرف فہم، تدبر اور معاملہ فہمی میں بسا اوقات عقل مند مردوں پر بھی سبقت لے جاتی ہیں۔

اب آتے ہیں اعتراضات کے جوابات کی طرف:

الف: حدیث میں عورت کو ناقص العقل مطلقاً نہیں کہا گیا بلکہ یہ بات ایک خاص سیاق میں کہی گئی ہے، اور وہ سیاق ہے گواہی کا، اور ناپاکی کے ایام میں نماز نہ پڑھنے کا، یہ وضاحت حدیث میں خود ہی موجود ہے، اس لئے مذکورہ حدیث سے مطلقاً عورت کے ناقص العقل ہونے

پر استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

ب: حدیث کے اسی حصے میں، جہاں عورتوں کے لیے ''نقصِ عقل'' کا ذکر ہے، وہیں ان کے ایک نمایاں نفسیاتی اور اثر انگیز وصف کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم میں سے بعض عورتوں کا اثر ایک مضبوط اور صاحبِ رائے مرد کی عقل پر بھی غالب آجاتا ہے۔'' اس سے کم از کم یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ حدیث کا مقصد عورت کو مطلقاً بے عقل، کم فہم یا بے اثر مخلوق قرار دینا نہیں؛ بلکہ اس میں عورت کے ایک مؤثر نفسیاتی وصف کا بھی اعتراف موجود ہے۔

ج: اس حدیث میں نقص سے مراد ایمان اور تقویٰ میں کمی نہیں ہے، بلکہ یہ شرعی رخصت کا ذکر ہے، جس سے عورت کو کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

د: یہاں نقص کلی نہیں بلکہ جزوی ہے، یعنی زندگی کے تمام شعبہ ہائے حیات میں عورت کو ناقص قرار دینا درست نہیں۔ اسی اصول کی وضاحت کرتے ہوئے سید محمد طنطاوی نے مرد کی قوامیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ آیت میں مذکور تفضیل سے مراد ایک جنس کی دوسری جنس پر عمومی تفضیل ہے، ہر فرد کی دوسرے فرد پر نہیں؛ کیونکہ بعض عورتیں بعض مردوں سے زیادہ عقل اور علم رکھنے والی ہوسکتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''والمراد بالتفضيل في قوله بِما فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلى بَعْضٍ تفضيل الجنس على الجنس لا تفضيل الآحاد على الآحاد. فقد يوجد من النساء من هي أقوى عقلا وأكثر معرفة من بعض الرجال۔''

(التفسیر الوسیط، ج۳، ص:۱۳۷)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرد و عورت کے درمیان کسی عمومی تفضیل کا مطلب یہ نہیں کہ ہر مرد ہر عورت سے افضل یا زیادہ عقل مند ہے؛ افراد کے درمیان صلاحیت، علم اور کمال کے اعتبار سے صورتِ حال مختلف ہوسکتی ہے۔

مرد و عورت میں مساوات

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اسلام نے عورت کو بلند مقام و مرتبہ عطا کیا ہے، زیادہ معاملات میں عورت مرد دونوں کو یکساں حیثیت حاصل ہے، قرآن و احادیث میں اس کی تفصیلات موجود ہیں لیکن اسی کے لئے اسلام میں عورت اور مردونوں کے فطری تقاضوں کے پس منظر میں الگ الگ میدان اور الگ الگ دائرہ کار تفویض کیا ہے، اس لحاظ سے کہیں کہیں دونوں کی کارکردگی میں فرق بھی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ناقص العقل والی حدیث اسلام میں تصورِ مساوات مرد و زن کے خلاف نہیں ہے۔

گواہی کے مسئلہ سے استدلال

یہ کہنا کہ ''گواہی ایک قانونی مسئلہ ہے، ذہانت کا معیار نہیں'' اپنی جگہ درست ہے، لیکن اس سے حدیثِ مبارکہ پر اعتراض لازم نہیں آتا۔ اس لیے کہ حدیث نے عورت کو مطلقاً کم عقل یا کم ذہین قرار نہیں دیا، بلکہ اس میں نقصِ عقل کی تعبیر کو ایک مخصوص شرعی حکم، یعنی بعض معاملات میں گواہی کے فرق، کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی آیتِ دَین میں بعض مخصوص مالی معاملات کی دستاویز اور گواہی کے سلسلے میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس کی حکمت بھی واضح کی گئی ہے کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى۔ (بقرہ: ۲۸۲)

یعنی اگر ایک بھول جائے یا معاملے کو یاد رکھنے میں لغزش ہو تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ اس لیے حدیث کا مقصد یہ بتانا نہیں ہے کہ عورت ذہنی طور پر مرد سے کمتر ہے۔

نقص کی تعبیر پر اعتراض

یہ اعتراض بھی کیا جاسکتا ہے کہ: اگر ''نقصِ عقل'' کا مطلب ذہانت کی کمی نہیں، تو پھر حدیث میں اسے ''نقصِ عقل'' کیوں کہا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عقل ایک وسیع لفظ ہے۔ اس کے استعمالات میں فہم، ضبط، یادداشت، ادراک اور کسی معاملے کو درست طور پر محفوظ رکھنے کی صلاحیت وغیرہ شامل ہوسکتے ہیں، حافظ ابن حجر اور دیگر شارحین نے عقل سے متعلق بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔

دورِ جدید کے خواتین کی کامیابی سے استدلال

جدید دور کی خواتین کی کامیابی حدیث کے خلاف دلیل نہیں ہے، یہ کہنا کہ آج خواتین ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، وکیل، پروفیسر یا محقق بن رہی ہیں، ایک اہم سماجی حقیقت ہے؛ لیکن اس سے حدیث کا حکم رد نہیں ہوتا۔ کسی حکم کے شرعی دائرے اور کسی فرد کی انفرادی صلاحیت میں کوئی تضاد نہیں۔ کسی خاص معاملے میں ایک شرعی ضابطے کا وجود اس بات کی نفی نہیں کرتا کہ افراد اپنی علمی، فکری یا عملی صلاحیتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتے ہیں۔

کیا یہ حدیث معاشرہ میں عورت کی تحقیر کا ذریعہ بنی؟

یہ کہنا کہ حدیث ''ناقصات عقل ودین'' معاشرے میں عورت کی تحقیر اور امتیازی سلوک کا سبب بنی، تاریخی طور پر بعض صورتوں میں یہ قابلِ بحث ہوسکتا ہے۔۔۔

(باقی صفحہ نمبر ۱۴ر پر)

ایک

مطالعۂ سیرت کا صحیح منہج

مولانا محمد شاہد ناصری حنفی (ادارہ دعوت السنہ ویلفیئر ٹرسٹ ممبئی)

انسانی تاریخ کے ہر دور میں ایسے حالات پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے حق و باطل، خیر و شر، ہدایت و ضلالت اور عدل و ظلم کے درمیان امتیاز کو دھندلا دینے کی کوشش کی۔ ہر زمانے کے اپنے فکری، اخلاقی اور تہذیبی چیلنج رہے ہیں، لیکن ان تمام تغیرات کے باوجود ایک حقیقت کبھی تبدیل نہیں ہوئی، اور وہ یہ کہ امتِ محمدیہ کی صحیح رہنمائی کا سب سے محفوظ، روشن اور ناقابلِ خطا سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ ہے۔ ماضی میں بھی جب امت کو فکری انتشار، اعتقادی لغزش یا عملی کمزوری کا سامنا ہوا تو اس نے سیرتِ نبوی کی طرف رجوع کیا، آج بھی اسی رجوع کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے، اور آنے والے زمانوں میں بھی یہی سیرت امت کے لیے ہدایت کا سب سے مضبوط مینار بنی رہے گی۔

ایک صاحبِ ایمان کے لیے سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کوئی اختیاری ذوق یا محض علمی مشغلہ نہیں، بلکہ ایمان کی تکمیل، عقیدے کی پختگی، اعمال کی درستی اور اخلاق کی اصلاح کا ناگزیر ذریعہ ہے۔ جس قدر بندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ سے واقف ہوتا جاتا ہے، اسی قدر اس کے دل میں محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گہری ہوتی ہے، اتباع کا جذبہ مضبوط ہوتا ہے اور دین کی جامع حقیقت اس پر منکشف ہوتی ہے۔ عقیدۂ توحید کی حفاظت ہو، عبادات میں اخلاص پیدا کرنا ہو، معاملات میں دیانت اختیار کرنی ہو، دعوت و اصلاح کا صحیح منہج سیکھنا ہو یا صبر، شکر، توکل اور استقامت کی عملی تصویر دیکھنی ہو، ہر میدان میں سیرتِ طیبہ ہی سب سے روشن رہنما ہے۔

یہ حقیقت بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں مختلف علوم و فنون پر برسوں کی محنت کی جاتی ہے، حدیث، فقہ، اصول، تفسیر، نحو، صرف اور بلاغت میں غیر معمولی دراز نفسی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، جو یقیناً ضروری اور باعثِ قدر ہے۔ لیکن جس ذاتِ اقدس کی زبان سے یہ تمام علوم امت تک پہنچے، جس کے عمل نے قرآن کی عملی تفسیر پیش کی، اور جس کی زندگی ان تمام علوم کی روح اور مقصود ہے، اس کی سیرت کے مطالعے میں بھی اسی سے بڑھ کر سنجیدگی، وسعت اور استقامت مطلوب ہے۔ اگر سیرتِ نبوی کا مطالعہ محض چند واقعات یا مختصر کتابوں تک محدود ہو جائے تو دین کا وہ جامع تصور پیدا نہیں ہوتا جو ایک داعی، ایک عالم اور ایک صاحبِ ایمان کے لیے ناگزیر ہے۔

اسی لیے سیرتِ طیبہ کو ایک مستقل علم، ایک مربوط فن اور اسلامی علوم کی اساس سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ اس کا مطالعہ جتنا گہرا، منظم اور مستند ہوگا، اتنا ہی ایمان میں استحکام، فکر میں اعتدال، عمل میں اخلاص اور دعوت میں بصیرت پیدا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے محققین اور اہلِ علم نے سیرتِ نبوی کے مطالعے کو امت کی دینی، علمی اور عملی زندگی کی بنیادی ضرورت قرار دیا ہے۔

جب ہم قرآنِ مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو صرف ایک تاریخی واقعہ یا سوانحی سرمایہ بنا کر نہیں چھوڑا، بلکہ اسے قیامت تک آنے والے تمام اہلِ ایمان کے لیے نمونۂ عمل قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴾ (الأحزاب: ۲۱) اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (آل عمران: ۳۱) یہ دونوں آیات اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح واضح کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ، محبتِ الٰہی کا معیار، اور ایمان کی صحت کا پیمانہ اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، اور اتباع اس وقت تک صحیح معنی میں ممکن نہیں جب تک انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی، آپ کے معمولات، اخلاق، دعوت، عبادات، معاملات، سیاست، معاشرت اور جہاد کے اصولوں سے واقف نہ ہو۔ گویا سیرتِ طیبہ کا مطالعہ اتباعِ نبوی کی پہلی سیڑھی ہے۔

یہاں ایک حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ سیرتِ نبوی کا مقصد محض تاریخی معلومات فراہم کرنا نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص غزوات کی تاریخیں، اسفار کی تفصیلات اور واقعات کے نام تو جانتا ہو، لیکن ان سے ایمان کی حرارت، عمل کی اصلاح اور کردار کی تعمیر حاصل نہ کرے تو اس نے سیرت کے جسم کو دیکھا، روح کو نہیں پایا۔ سیرت کا اصل مطالعہ وہ ہے جو دل میں محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا کرے، عقل کو بصیرت عطا کرے، عمل کو سنت کے سانچے میں ڈھال دے اور انسان کو اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب بنا دے۔

اسی لیے محدثین نے سیرت کو حدیث سے الگ نہیں سمجھا، مفسرین نے اسے قرآن کے فہم کی کلید قرار دیا، اور فقہاء نے اسے احکامِ شریعت

کے عملی نفاذ کا بہترین نمونہ بتایا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم نظریہ پیش کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس نظریے کی عملی تفسیر بن کر سامنے آتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے مختصر مگر جامع الفاظ میں فرمایا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق سراپا قرآن تھا) اسی لیے جو شخص قرآن کو عملی زندگی میں متحرک صورت میں دیکھنا چاہتا ہے، اسے سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ امت کے اکابر علماء نے سیرت نگاری کو محض ایک تاریخی فن نہیں سمجھا بلکہ اسے ایمان کی حفاظت اور امت کی فکری تربیت کا ذریعہ قرار دیا۔ امام ابن اسحاق سے لے کر ابن ہشام، امام ابن کثیر، امام ذہبی، قاضی عیاض، حافظ ابن عبدالبر اور عصرِ حاضر میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سلیمان منصور پوری اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا لطف الرحمن ہرسنگھ پوری، مولانا صفی الرحمن مبارکپوری رحمہم اللہ تک، ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں اس بحرِ بے کراں سے امت کو فیض پہنچایا۔ ان حضرات کی تصنیفات کا باہم مطالعہ قاری کے سامنے سیرت کا ایک وسیع، متوازن اور مستند نقشہ پیش کرتا ہے، جبکہ کسی ایک کتاب پر اکتفا کرنا بسا اوقات فہمِ سیرت کو محدود کر دیتا ہے۔ یہ بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے کہ سیرتِ نبوی ایک مستقل علم ہے، جس کے اپنے اصول، اپنے مصادر اور اپنی تحقیق کا ایک باقاعدہ منہج ہے۔ جس طرح حدیث، تفسیر اور فقہ میں ہر روایت بلا تحقیق قبول نہیں کی جاتی، اسی طرح سیرت میں بھی روایت کی صحت، تاریخی قرائن، اسناد اور ائمۂ فن کی آراء کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہی علمی احتیاط انسان کو غیر مستند واقعات، مبالغہ آرائی اور افسانوی روایات سے محفوظ رکھتی ہے اور سیرت کے حقیقی حسن سے روشناس کراتی ہے۔

مطالعۂ سیرت کے باب میں ایک بنیادی حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ سیرتِ نبوی کا سرمایہ اتنا وسیع، ہمہ گیر اور گہرائی لیے ہوئے ہے کہ کسی ایک مصنف یا ایک کتاب میں اس کے تمام پہلو جمع نہیں ہو سکتے۔ ہر صاحبِ قلم نے اپنے ذوقِ تحقیق، اپنے علمی منہج اور اپنے مقصود کے مطابق اس بحرِ بے کراں سے خوشہ چینی کی ہے۔ اس لیے کسی ایک کتاب کو آخری اور کامل مرجع سمجھ لینا درست نہیں۔ ایک اچھی کتاب مطالعے کا آغاز تو بن سکتی ہے، لیکن منزل نہیں بن سکتی۔

اسی بنا پر اہلِ علم ہمیشہ اس بات کی تلقین کرتے آئے ہیں کہ سیرت کے مطالعے میں شہرت کے بجائے استناد کو معیار بنایا جائے۔ بسا اوقات کوئی کتاب عوام میں بہت مقبول ہوتی ہے، لیکن تحقیقی اعتبار سے اس میں ایسی روایات شامل ہو جاتی ہیں جن پر محدثین اور مؤرخین نے کلام کیا ہے۔ اس کے برعکس بعض کتابیں شہرت میں اگرچہ کم ہوں، لیکن علمی اعتبار سے زیادہ مضبوط اور قابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ ایک سنجیدہ طالبِ علم کا کام یہی ہے کہ وہ معتبر مصادر سے اپنا تعلق قائم کرے اور تدریج کے ساتھ اپنی علمی بصیرت کو وسیع کرتا رہے۔ عربی زبان سے واقف اہلِ علم کے لیے اصل مصادر سے تعلق پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ ابن اسحاق کی روایت، ابن ہشام کی السیرۃ النبویۃ، ابن عبدالبر کی الدرر، امام ابن کثیر، امام ذہبی اور قاضی عیاض کی تصنیفات سیرت کے طالبِ علم کو بنیادی مآخذ سے روشناس کراتی ہیں۔ اسی طرح اردو داں طبقے کے لیے علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی، علامہ سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نبیِ رحمت اور مولانا صفی الرحمن مبارکپوری کی الرحیق المختوم اور مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہم اللہ کی خطباتِ بنگلور ایسی کتابیں ہیں جن سے مطالعے کی مضبوط بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔ تاہم ان میں بھی تدریج اور تقابل کا اصول ملحوظ رہنا چاہیے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ سیرت کی کتابیں انسانی تحقیق کا نتیجہ ہیں، اس لیے بعض روایات یا واقعات پر بعد کے اہلِ علم نے نقد و نظر بھی کی ہے۔ اس علمی تنقید کو سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض سمجھ لینا بڑی غلطی ہے۔ تنقید دراصل کسی روایت، کسی استدلال یا کسی مؤرخ کے طرزِ تحقیق پر ہوتی ہے، اور یہی علمی دیانت کا تقاضا بھی ہے۔ لہٰذا طالبِ علم کو چاہیے کہ اختلافات سے گھبرانے کے بجائے تحقیق کے اصولوں کو سمجھے اور اہلِ فن کی آراء سے استفادہ کرے۔ اسی طرح اگرچہ عربی کی متعدد اہم کتابوں کے اردو تراجم موجود ہیں، لیکن ترجمہ بہرحال اصل متن کا قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ مترجم کی فہم، اسلوب اور تعبیر بعض اوقات مفہوم میں فرق پیدا کر دیتی ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو اصل مصادر سے رجوع کیا جائے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو معتبر اور محققانہ تراجم سے استفادہ کیا جائے۔

الغرض، سیرتِ طیبہ کا مطالعہ محض ایک علمی مشغلہ نہیں بلکہ ایمان کی بقا، محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے استحکام، اتباعِ سنت کے فروغ اور اسلامی شخصیت کی تعمیر کا بنیادی وسیلہ ہے۔ آج امت جن اعتقادی، فکری، اخلاقی اور تہذیبی آزمائشوں سے دوچار ہے، ان کا مؤثر علاج اسی وقت ممکن ہے جب سیرتِ نبوی ہمارے مطالعے کا بھی مرکز بنے اور ہماری زندگی کا بھی محور۔ مدارس، جامعات، مساجد اور گھروں میں سیرت کا منظم، مسلسل اور تحقیقی مطالعہ عام کیا جائے، کیونکہ یہی وہ سرچشمہ ہے جس سے ایمان تازگی پاتا ہے، علم کو بصیرت ملتی ہے، دعوت کو اعتدال حاصل ہوتا ہے اور کردار کو وہ پختگی نصیب ہوتی ہے جو دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

☆☆☆

عصر حاضر

فکری انتشار کے اسباب اور سیرتِ نبوی ﷺ

مولانا محمد عاشق صدیقی ندوی (معہد قاضی یوسف ناصحی مظفر نگر)

مکہ کی گلیوں میں کبھی ایک ایسا معاشرہ آباد تھا جہاں طاقت حق کی دلیل سمجھی جاتی تھی، کمزور کا حق طاقتور کی مرضی پر منحصر تھا، قبائلی تعصب انسان کی شناخت بن چکا تھا اور اخلاقی اقدار مفاد کے سامنے بے وزن ہوتی جا رہی تھیں۔ ہر قبیلہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا تھا اور ہر طاقتور اپنے مفاد کو قانون بنانے پر آمادہ تھا۔ پھر محمد ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے سب سے پہلے لوگوں کے دلوں میں ایک نیا یقین پیدا کیا۔ آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ تمہارا رب ایک ہے، تمہاری اصل ایک ہے، تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری زندگی بے مقصد نہیں۔

یہ تبدیلی صرف عقیدے کی تبدیلی نہیں تھی؛ یہ انسان کے سوچنے کے انداز کی تبدیلی تھی۔

آج صدیوں بعد دنیا کی صورت بدل گئی ہے، مسائل کے نام بدل گئے ہیں، ذرائع بدل گئے ہیں، لیکن انسان کی بنیادی الجھنیں بہت مختلف نہیں ہوئیں۔ آج بھی طاقت حق پر اثر انداز ہوتی ہے، آج بھی مفاد اخلاق پر غالب آ جاتا ہے، آج بھی انسان اپنی خواہش کو دلیل بنا لیتا ہے اور آج بھی اسے اپنی زندگی کے مقصد کی تلاش ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج کا انتشار زیادہ وسیع ہے اور اس کے ذرائع زیادہ طاقتور۔ یہ فکری انتشار، نظریاتی بے یقینی اور مقصدِ زندگی سے دوری ہے۔

آج کا انسان معلومات کے اعتبار سے پہلے سے کہیں زیادہ مالا مال ہے، مگر بصیرت اور اطمینان کے اعتبار سے شدید اضطراب کا شکار ہے۔ اس کے پاس رابطے کے بے شمار ذرائع ہیں، مگر دلوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں؛ سائنس نے کائنات کے بہت سے راز آشکار کر دیے، مگر انسان اپنے وجود کے مقصد سے بے خبر ہوتا جا رہا ہے؛ مادی ترقی نے زندگی کو سہولتیں عطا کیں، مگر سکونِ قلب چھین لیا۔ انسان دنیا کو مسخر کرنے کے طریقے تو جانتا ہے، لیکن اپنی خواہشات پر قابو پانے اور اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھنے سے غافل ہوتا جا رہا ہے۔

فکری انتشار سے مراد یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں زندگی، انسان، کائنات، اخلاق، آزادی، ترقی اور مقصدِ حیات کے بارے میں متضاد تصورات جمع ہو گئے ہیں اور حق و باطل میں امتیاز کا مضبوط معیار باقی نہ رہا۔ قرآن مجید تقویٰ کو صحیح فکر اور حق شناسی کا ذریعہ قرار دیتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا﴾ (الأنفال: ۲۹) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح فکر محض معلومات کا نام نہیں بلکہ بصیرت اور حق شناسی کا نام ہے۔

موجودہ فکری بحران کی سب سے بنیادی وجہ انسان کا اپنے خالق سے تعلق کمزور کر لینا ہے۔ جب انسان اپنے وجود کو محض مادی وجود سمجھنے لگتا ہے تو اس کی زندگی کا مقصد بھی مادی بن جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ ''یاد رکھو! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔'' (الرعد: ۲۸)

آج اضطراب، بے مقصدیت اور ذہنی بے چینی کے بہت سے مظاہر اسی روحانی خلا سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان نے دل کے سکون کو مال، شہرت، تفریح، تعلقات اور مادی آسائشوں میں تلاش کیا، لیکن جس چیز سے دل کا اطمینان وابستہ ہے، اسے نظر انداز کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مثل الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لَا يَذْكُرُ رَبَّهُ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ ''جو اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور جو اپنے رب کو یاد نہیں کرتا، ان دونوں کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔'' (صحیح البخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی زندگی صرف جسم کی زندگی نہیں؛ دل کی زندگی بھی ضروری ہے۔ دل کی دنیا آباد ہو گی تو کام بنے گا، ورنہ نہیں۔

آج کامیابی کا معیار زیادہ تر دولت، منصب، شہرت، طاقت اور ظاہری آسائشوں کو سمجھا جاتا ہے۔ انسان کی قدر اس کی شخصیت، تقویٰ، کردار اور خدمت سے نہیں بلکہ اس کے بینک بیلنس، عہدے، شہرت اور سماجی حیثیت سے کی جانے لگی ہے۔ قرآن کریم نے دنیاوی زندگی کی حقیقت کو یوں بیان فرمایا:

﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ﴾ (الحدید: ۲۰) ''جان لو کہ دنیا کی زندگی کھیل، تماشا، زینت، آپس میں فخر اور مال و

اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کا نام ہے۔"

اسلام دنیا کو ترک کرنے کا نہیں، بلکہ دنیا کو مقصد کے بجائے ذریعہ بنانے کا درس دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ "دنیا میں ایسے رہو جیسے تم مسافر ہو یا راستے سے گزرنے والے ہو۔" (صحیح البخاری)

یہ تصور انسان کو مادہ پرستی کے بجائے مقصدیت عطا کرتا ہے۔

جدید انسان خود کو آزاد سمجھتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی مارکیٹ کی خواہشات کا غلام ہے، کبھی شہرت کا، کبھی سوشل میڈیا کی پسندیدگی کا اور کبھی اپنی نفسانی خواہشات کا۔ قرآن کریم فرماتا ہے: ﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ﴾ "کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا؟" (الجاثیہ:۲۳)

اسلام انسان کو خواہشات کا غلام نہیں بلکہ اپنے نفس کا نگہبان بناتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ "طاقتور وہ نہیں جو کشتی میں دوسرے کو پچھاڑ دے، بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔" (متفق علیہ)

یہ حدیث موجودہ دور کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے: حقیقی طاقت خود پر قابو ہے۔ اس لیے سیرتِ نبوی ﷺ انسان کو خواہشات کا غلام بننے کے بجائے اپنے نفس کا نگہبان بننے کی تربیت دیتی ہے۔

موجودہ دور میں معلومات کے سیلاب نے بھی فکری انتشار میں اضافہ کیا ہے۔ سوشل میڈیا پر خبر کو تحقیق کے بغیر پھیلانا عام ہو گیا ہے۔ قرآن کا واضح اصول ہے: ﴿إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ (الحجرات:٦)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ (مسلم)۔

یہ نبوی اصول ڈیجیٹل دور میں خاص اہمیت رکھتا ہے کہ ہر سنی ہوئی بات آگے پہنچانے کے بجائے تحقیق کی جائے۔ علم اور اخلاق کا باہمی تعلق بھی ضروری ہے۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کو بے شمار طاقتیں دی ہیں، مگر اخلاقی ذمہ داری کے بغیر یہی طاقت نقصان کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ علم کو اخلاق، ذمہ داری اور انسانیت کی خدمت سے جوڑتی ہے۔ اس لیے علم کا مقصد صرف معلومات حاصل کرنا نہیں بلکہ انسان کی اصلاح اور خیر کا فروغ ہونا چاہیے۔

عصرِ حاضر کے فکری انتشار کا سب سے جامع علاج سیرتِ نبوی ﷺ میں موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے ایسے معاشرے کی اصلاح فرمائی جو شرک، قبائلی تعصب، ظلم اور اخلاقی بے راہ روی کا شکار تھا۔ آپ ﷺ نے اصلاح کا آغاز انسان کے عقیدے اور فکر سے کیا، اس کے دل کو اللہ سے جوڑا، آخرت کا یقین پیدا کیا اور پھر اسی انسان کے ذریعے معاشرے کو تبدیل کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کی اصلاح انسان کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں اور انسان کی اصلاح فکر و قلب کی اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ سیرت کا بنیادی فکری سبق توحید ہے۔ توحید انسان کو مخلوق کی غلامی سے نکال کر خالق کی بندگی عطا کرتی ہے۔ جب اللہ کی عظمت دل میں پیدا ہو جاتی ہے تو مال، شہرت، طاقت اور لوگوں کی خوشنودی زندگی کا مقصد نہیں رہتے۔ یہی فکری آزادی آج کے انسان کو سیرتِ نبوی ﷺ عطا کر سکتی ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ انسان کو عزت و احترام کا صحیح معیار بھی دیتی ہے۔ قرآن فرماتا ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ (الإسراء: ٧٠)۔

انسان کی قدر مال، نسل، رنگ، خاندان یا شہرت سے نہیں بلکہ ایمان، کردار اور تقویٰ سے ہوتی ہے۔ آج کے معاشرے میں مصنوعی معیارِ برتری نے احساسِ کمتری اور تکبر کو جنم دیا ہے، جبکہ سیرت انسان کو حقیقی انسانی قدر سے روشناس کراتی ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ رحمت اور عدل کی تعلیم بھی دیتی ہے۔ قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کو پوری انسانیت کے لیے رحمت قرار دیا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾، "ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

(الانبیاء:۱۰۷)

یہ آیت سیرتِ نبوی ﷺ کے عالمی پہلو کو سامنے رکھتی ہے۔ آپ ﷺ کی رحمت کسی خاص قوم یا طبقے تک محدود نہیں تھی۔ آپ ﷺ نے کمزوروں کے ساتھ شفقت کی، یتیموں کے حقوق کی حفاظت فرمائی، مسکینوں کی خبرگیری کی، پڑوسیوں کے حقوق بیان کیے، غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی اور جانوروں تک کے ساتھ رحمت کا معاملہ سکھایا۔ انسانیت کو سب سے زیادہ اسی رحمت کی ضرورت ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: "مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ" (صحیح البخاری، صحیح مسلم)۔

اسی طرح اختلاف کے باوجود عدل قائم

رکھنے کا حکم دیا گیا: ﴿اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ (المائدہ: ۸)۔

آج فکری اور اجتماعی انتشار کے دور میں رحمت اور عدل دونوں کی شدید ضرورت ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک عظیم پہلو نوجوانوں کی تربیت بھی ہے۔ آج کی دنیا میں نوجوان سب سے زیادہ فکری یلغار کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں دنیا بھر کی معلومات ہیں، مگر ان کے سامنے زندگی کا واضح مقصد ہمیشہ موجود نہیں۔ اگر نوجوان کو صرف یہ بتایا جائے کہ یہ مت کرو، وہ مت دیکھو، اس سے بچو، اس کے قریب نہ جاؤ، تو ممکن ہے وہ کچھ وقت کے لیے رک جائے؛ لیکن اگر اسے مقصد، علم، ایمان، کردار اور ذمہ داری دی جائے تو وہ خود اپنے راستے کی حفاظت کرسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں پر اعتماد کیا، انہیں ذمہ داریاں دیں اور انہیں امت کی تعمیر میں شریک کیا۔ اس نبوی منہج کی آج شدید ضرورت ہے۔

اسی طرح خاندانی نظام کے بحران کا علاج بھی سیرت میں موجود ہے۔ آج انسان باہر کی دنیا میں اخلاق کا دعویٰ کرتا ہے، مگر گھر کے اندر اس کا اصل کردار ظاہر ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي، ’’تم میں بہترین وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہترین ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔‘‘ (جامع الترمذی)

سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ اصلاح کا آغاز گھر سے ہوتا ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے رحمت بنیں، والدین اولاد کے لیے محبت اور تربیت کا ذریعہ بنیں، اولاد والدین کی عزت اور خدمت کو سعادت سمجھے اور گھر محض رہنے کی جگہ نہیں بلکہ کردار سازی کا مرکز بنے۔ نوجوانوں کو محض ممانعتوں سے نہیں بلکہ ایمان، علم، مقصد، کردار اور ذمہ داری سے مضبوط کرنا ضروری ہے۔

سیرت انسان کو مایوسی سے بھی نکالتی ہے۔ آج کا انسان جب حالات کو اپنے قابو سے باہر دیکھتا ہے تو جلد شکست خوردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ہر مرحلہ صبر، امید، توکل اور مسلسل جدوجہد کا سبق دیتا ہے۔ مکہ کی سختیاں ہوں، شعبِ ابی طالب کی آزمائش ہو، طائف کا واقعہ ہو یا ہجرت کا مشکل سفر، ہر موقع پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مشکلات راستے کا حصہ ہوسکتی ہیں، منزل نہیں۔ قرآن کہتا ہے: ﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا، إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾، ’’بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔‘‘ (الشرح: ۵-۶) یہی نبوی تربیت آج کے انسان کو یہ حوصلہ دے سکتی ہے کہ بحران میں ٹوٹنا نہیں، حالات کے سامنے خود کو بے بس نہیں سمجھنا، اللہ پر توکل کے ساتھ صحیح تدبیر اختیار کرنا اور کوشش جاری رکھنا ہے۔

سیرت کا اصل حسن یہ ہے کہ یہ صرف نظریات نہیں دیتی، بلکہ نظریات کو کردار میں تبدیل کر کے دکھاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو کہا، اسے اپنی زندگی میں کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ نے عدل کی بات کی تو عدل قائم کر کے دکھایا، رحمت کی تعلیم دی تو دشمنوں کے ساتھ بھی رحمت کا معاملہ کیا، صبر کا حکم دیا تو خود صبر کی بلند ترین مثال بنے، توکل کی دعوت دی تو انتہائی مشکل حالات میں بھی اللہ پر اعتماد قائم رکھا، اور آخرت کی جواب دہی کا تصور دیا تو پوری زندگی اسی احساس کے ساتھ گزاری۔ قرآن اسی لیے فرماتا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الأحزاب: ۲۱)۔

لہٰذا آج ضرورت صرف سیرت کے واقعات جاننے کی نہیں بلکہ اس کے فکری اور تربیتی منہج کو اپنانے کی ہے۔ گھروں میں سیرت کا اخلاق، مدارس اور تعلیمی اداروں میں اس کا تربیتی وفکری پہلو، دعوت میں اس کی حکمت، اختلاف میں اس کا عدل، بازار میں اس کی دیانت اور معاشرے میں اس کی رحمت نظر آنی چاہیے۔

سیرتِ نبوی ﷺ انسان کو اللہ سے جوڑتی، اسے اس کی اصل حقیقت سے آگاہ کرتی، دوسروں کے حقوق یاد دلاتی اور زندگی کا مقصد سمجھاتی ہے۔ آج دنیا کو ایسی ترقی کی ضرورت ہے جو انسان کو طاقتور بنانے کے ساتھ رحم دل بھی بنائے، ایسے علم کی ضرورت ہے جو خوفِ خدا پیدا کرے، ایسی آزادی کی ضرورت ہے جو ذمہ داری کے ساتھ ہو اور ایسی طاقت کی ضرورت ہے جو عدل کے تابع ہو۔ اس لیے عصرِ حاضر کے فکری انتشار سے نکلنے کا راستہ ماضی میں واپس جانا نہیں بلکہ نبوی اصولوں کو موجودہ مسائل پر منطبق کرنا ہے۔ انسان کی بنیادی ضرورتیں آج بھی وہی ہیں: اللہ کی معرفت، مقصدِ زندگی، اخلاقی معیار، محبت، عدل، رحمت اور امید۔ ان تمام ضرورتوں کا جامع اور متوازن جواب سیرتِ محمدی ﷺ میں موجود ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ہم سیرت کو کتابوں اور تقریروں تک محدود نہ رکھیں بلکہ اسے اپنی زندگی کا عملی منہج بنائیں۔

☆☆☆

پیام سیرت

عصرِ حاضر کا بحران اور سیرتِ طیبہ کا پیغام

مولانا محمد سلمان بجنوری ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

اکیسویں صدی کا انسان خود کو ترقی کے اس مقام پر دیکھ رہا ہے، جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز فتوحات نے زندگی کا پورا منظرنامہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ خلا میں چاند کی تسخیر، مریخ پر پہنچنے کی تیاری، سمندروں کی گہرائیوں سے خزانوں کی برآمدگی اور مواصلاتی انقلاب (Communications Revolution) نے کرۂ ارض کو ایک عالمی گاؤں (Global Village) میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں مہینوں کی مسافتیں سیکنڈوں کے ایک کلک میں سمٹ آئی ہیں۔ مادی دولت اور وسائل کی ایسی ریل پیل تاریخ انسانی نے پہلے کبھی نہیں دیکھی، لیکن اس چمکتی دمکتی، آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والی مادی دنیا کے عین وسط میں کھڑا انسان اندر سے بالکل کھوکھلا اور شدید ترین ذہنی و روحانی کرب کا شکار ہے۔ مادی آسائشوں کا انبار تو لگا ہے، مگر دلوں کا چین اور روح کا سکون کہیں گم ہو چکا ہے۔ پوری انسانیت پر ایک مستقل اور گہری بے قراری و بے اطمینانی کی سی کیفیت ہے۔ یہ دور بظاہر علم و آگہی، احساس و شعور کا دور ہے، لیکن حقیقت میں یہ ایک مہلک اور خطرناک ”جدید جاہلیت“ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

انسانیت آج اخلاقی دیوالیہ پن کی اس انتہا کو پہنچ چکی ہے، جہاں ہر سو خود غرضی کا دور دورہ ہے، رشتوں کا تقدس پامال ہو رہا ہے، بین الاقوامی سطح سے لے کر خانگی سطح تک اختلافات اور نفرتوں کی آگ بھڑک رہی ہے، سودی نظام نے غریب کو کچل کر رکھ دیا ہے، فحاشی، بے حیائی اور عریانیت نے آزادی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے، انسانی خون کی ارزانی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ آئے دن کی قتل و غارت گری اور عصمت دری اب عام سی بات معلوم ہوتی ہے۔ انسان جانوروں سے بدتر ہو چکا ہے۔ یہ اپنی نفسانی تسکین کی خاطر نہ بڑی خواتین کو دیکھ رہا ہے، نہ چھوٹی بچیوں کو چھوڑ رہا ہے، کتوں اور بھیڑیوں کی طرح سب پر حملہ آور ہے۔ حیوانیت اور درندگی کی انتہا تو اس وقت ہوئی کہ دو ڈھائی سال کی بچی ہی کو اپنی ہوس کا شکار بنا لیا۔ کس ترقی کی بات کی جائے! کس ٹیکنالوجی کی بات کی جائے! کس آزادی کی بات کی جائے!

آج والدین اپنے بچوں کو اسکول بھیجتے ہوئے خوف محسوس کر رہے ہیں۔ بچے گھر کے باہر محفوظ نہیں ہیں۔ اگر بحفاظت ان کو اسکول تک پہنچا بھی دیا جائے تو نہ معلوم اسکول میں انسانی شکل میں کون سا بھیڑیا بیٹھا ہو جو ان کی پھول سی بچی کی عزت کو تار تار کر دے! اور اس ترقی یافتہ دور میں یہ سب کھلے عام ہو رہا ہے!

آج انسانیت شرمسار ہے، خون کے آنسو رو رہی ہے، سسک رہی ہے، بلک رہی ہے۔ جس کے سینے میں دھڑکتا انسانی دل ہے، وہ بے کل و بے قرار ہے، وہ امن و آشتی کی تلاش میں ہے، اس ضلالت و گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے نکلنے اور اجالے کی منتظر ہے۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ اس ترقی یافتہ دور سے اچھا تو زمانہ قدیم تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی اس طرح کی جہالت و درندگی نہیں تھی، جو آج کے اس نام نہاد مہذب دور میں ہے۔

دوسری جانب ان جھنجھوڑ دینے والے حادثات اور دل خراش واقعات سے حکمران طبقے کی پیشانی پر ذرا شکن نہیں پڑی، ان کو ذرا احساس نہیں۔ ان حادثات کے سدِّ باب کے لیے ان کے پاس نہ کوئی تدبیر ہے اور نہ کوئی حل موجود ہے۔ جب محافظ ہی چور ہوں اور ان کے دل میں کھوٹ ہو تو پھر کس سے خیر کی امید کی جا سکتی ہے؟ دنیا بھر کے مفکرین و فلاسفر ان خرابیوں پر قابو پانے کے لیے روز نئے قوانین، نظریات اور انسانی تدبیریں پیش کر رہے ہیں، لیکن یہ تمام مادی نسخے مرض کو گھٹانے کے بجائے بڑھا رہے ہیں، کیونکہ یہ اس انسانی فطرت کی باطنی اور اخلاقی اصلاح کرنے سے قاصر ہیں، جس کی خرابی تمام فتنوں کی جڑ ہے۔

انسانیت کو اس بحرانی دور اور زبوں حالی سے نکالنے اور نجات دلانے کا واحد حل صرف سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ کی پاکیزہ زندگی، درخشاں اصول اور روشن تعلیمات ہیں۔ چودہ سو سال پہلے کا عرب معاشرہ بھی اسی قسم کی بدترین گمراہی، جہالت، ظلم، اخلاقی پستی اور خونی دشمنی کا شکار تھا، جہاں انسانیت دم توڑ رہی تھی۔ ایسے تاریک دور میں حضورِ اکرم ﷺ تشریف لائے اور نبی کریم ﷺ نے کسی مادی قانون یا عسکری قوت کے بغیر اخلاقِ حسنہ اور وحیِ الٰہی کی تعلیمات کی بدولت ایک ایسا انقلاب برپا کیا، جس نے رہتی دنیا تک کے لیے امن و انصاف کا معیار قائم کیا، پوری انسانیت کے لیے بہترین رہنما اصول اور پاکیزہ زندگی کے نقوش چھوڑے، جس کی مثال رہتی دنیا تک پیش نہیں کی جا سکتی۔ آج کی جہالت و گمراہی کا علاج بھی اسی نبوی ﷺ نسخۂ کیمیا میں پوشیدہ ہے۔۔۔

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

اصلاحِ حال

آئیے! معاشرہ کو پرسکون بنائیں

مولانا محمد زین الحق ندوی (شعبہ دعوت وارشاد ندوۃ العلماء)

اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرہ کا نظامِ عدل چار اہم عناصر پر منحصر ہے: (۱) مسؤولیت (۲) شفافیت (۳) جواب طلبی (۴) منصفانہ کارروائی۔ جس جگہ اور جس زمانہ میں مذکورہ چار عناصر معاشرہ میں پائے جاتے ہیں تو وہ معاشرہ سکون، ترقی، باہمی اعتماد اور امن کا گہوارہ ہوتا ہے، اور جب مذکورہ لازمی عناصر کا فقدان ہوتا ہے تو پھر معاشرہ بدامنی، نااتفاقی، تنزلی اور آپسی ٹکراؤ کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس پہلو سے بھی اسلام بہت ہی مثالی ہدایات اور تعلیمات رکھتا ہے، جس کی روشنی میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے تاریخ میں روشن مثال رقم کی ہے، انسانیت آج اسی نظام کی پہلے سے کہیں زیادہ محتاج ہوتی جارہی ہے۔ ذیل میں چار بنیادی اصول اور عصرِ حاضر میں اس کی معنویت وقابلِ عمل تدابیر کو تحریر کیا جاتا ہے۔

(۱) مسؤولیت (Responsibility):

ہر انسان کو زمین پر اللہ نے اپنا خلیفہ (نائب) بنا کر ایک بڑی ذمہ داری دی ہے۔ یہ فرض شناسی اور امانت داری کا نام ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے، حدیثِ نبوی ﷺ: ''تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت (ماتحتوں) کے بارے میں سوال ہوگا'' یعنی عہدہ یا منصب ایک امانت ہے، کوئی ذاتی جاگیر نہیں ہے، لہٰذا ہر شخص اپنے دائرہ میں اور اپنے فرائض کا ذمہ دار ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کے فرائض ہیں اور جو اختیارات ہیں، اس کے لیے وہ جواب دہ ہے۔

(۲) شفافیت (Transparency):

اسلام ہر معاملہ کو واضح، سچا اور دھوکے سے پاک رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ چھپ کر فیصلے کرنے یا منافقانہ طرزِ عمل کی سخت ممانعت ہے۔ قرآنی حکم: **وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ** ''اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ'' (البقرہ: ۴۲)

رسول اللہ ﷺ نے بازار میں اناج کے ڈھیر میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو نیچے سے غلہ گیلا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اس گیلے حصے کو اوپر کیوں نہ رکھا، تاکہ لوگ دیکھ لیتے۔ جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں'' (صحیح مسلم) ایک مرتبہ ماہِ رمضان میں نبی اکرم ﷺ اعتکاف میں تھے، رات کے وقت آپ ﷺ کی زوجۂ مطہرہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ملنے تشریف لائیں، جب واپس ہونے لگیں تو نبی کریم ﷺ بھی ان کے ساتھ اٹھے۔ جب آپ ﷺ دروازہ کے قریب پہنچے تو مسجد نبوی کے دروازے کے قریب دو انصاری صحابی وہاں سے گزرے۔ اور آپ ﷺ کو انہوں نے سلام کیا اور آگے بڑھنے لگے۔ لیکن آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ذرا ٹھہر جاؤ، میرے ساتھ میری بیوی صفیہ ہیں (یعنی کوئی دوسرا نہیں) ان دونوں نے حیرانی کے ساتھ عرض کیا: سبحان اللہ! یارسول اللہ! ان حضرات پر آپ ﷺ کا یہ فرمانا بڑا شاق گزرا۔ آپ ﷺ نے اس پر فرمایا کہ ''شیطان انسان کے اندر اس طرح دوڑتا رہتا ہے جیسے جسم میں خون دوڑتا ہے۔ مجھے یہی خطرہ ہوا کہ کہیں تمہارے دلوں میں بھی کوئی وسوسہ پیدا نہ ہوجائے۔'' (بخاري: ۱۷/۱۷) لہٰذا مسؤول جو بھی فیصلے وہ کرے، جو بھی اقدامات وہ کرے، وہ لازماً متعلقہ افراد کے لیے واضح اور قابلِ فہم ہونا چاہیے تاکہ اجتماعی نظام میں بدگمانی کے مواقع نہ رہیں۔

(۳) جواب دهی (Accountability):

اسلامی تعلیمات کا پورا انحصار ہی ''آخرت میں جواب دہی'' کے یقین پر قائم ہے۔ دنیا کا کوئی عمل اللہ کی نظر سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ قرآنی حکم: **وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ** ''اور تم جو کچھ کرتے رہتے ہو، اس کے بارے میں تم سے ضرور پوچھ گچھ ہوگی" (النحل: ۹۳) اور ایک جگہ ارشادِ ربانی ہے: **فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ، وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ** ''پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا'' (الزلزال ۷-۸)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے: ''اپنا احتساب (حساب) خود کرو، اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے۔'' پس ہر ایک شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور جواب طلبی (Accountability) سے بددل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

(۴) منصفانہ کارروائی (Fair Trial):

اسلامی تعلیمات میں قانون سب کے لیے برابر ہے، خواہ وہ حکمران ہو یا عام شہری۔ جرم

ثابت ہوجانے کے بعد قانونی کارروائی کا حکم سب کے لیے یکساں ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُونُوا قَوَّامِینَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ خَبِیرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ''اے ایمان والو! انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو اللہ کے لیے کھڑے ہوجایا کرو، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرتے رہو، یہی تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلا شبہ اللہ تمہارے کاموں سے خوب واقف ہے''(المائدہ:۸)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے کی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی بڑا چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے، اور جب کوئی غریب چوری کرتا تو اسے سزا دیتے۔ خدا کی قسم! اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔''(صحیح بخاری)

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں عام شہری بھی بھرے مجمع میں امیر المؤمنین سے ان کے کُرتے کے کپڑے کے متعلق دریافت کر لیتا تھا۔ مذکورہ ارشادات و واقعات منصفانہ نظام کی روشن دلیل ہیں۔

عصرِ حاضر میں معاشرہ کی صورتِ حال یہ ہے کہ اگر کسی کے دل سے احساسِ ذمہ داری ختم ہوجائے یا پھر کم ہوجائے تو پھر ایسا شخص شفافیت کو بھی کم کردیتا ہے، جس کے بعد معاشرہ میں نہ امن قائم رہتا ہے اور نہ عدل و انصاف۔ عدمِ مسؤولیت کا جو رویہ ہے، اور بڑھتا ہوا رجحان ہے، یہ اس وقت جنم لیتا ہے جب انسان اپنے آپ کو جواب دہی سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے کہ میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔ جب یہ کیفیت کسی انسان کی ہوتی ہے تو پھر وہ اپنی تمام حدود کو پھلانگتا ہے، اختیارات کا بے جا استعمال کرتا ہے اور ہر قسم کے ظلم و ستم اور ناروا سلوک کو اختیار کرنے لگتا ہے۔

یہ جواب دہی کا تصور دراصل مؤمن کے لیے بریک (Brake) کا کام کرتا ہے، انسان کو روکنے کا کام کرتا ہے، انسان کو سنبھلنے کا موقع دیتا ہے۔قرآنِ کریم میں ''اتقوا اللہ'' کی بار بار تلقین و تذکیر اسی لیے ہے، لیکن جب اس چیز سے انسان اپنے آپ کو آزاد کرلیتا ہے تو پھر وہ جو چاہے کرتا چلا جائے اور اس کو کسی کی پروا نہیں ہوتی ہے۔ موجودہ وقت میں یہ چیز انتہا کو پہنچ رہی ہے، جس سے اجتماعی نظام کو اور معاشرہ کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے، کیا مشرق و مغرب، کیا عرب و عجم، ہر ایک اس سے متاثر ہے۔

ان حالات میں جب ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو واضح طور پر قرنِ اول میں معاشرہ کا نظام انتہائی عادلانہ اور مثالی پاتے ہیں۔ نتیجتاً معاشرہ کا ہر فرد امن و سکون سے مکمل طور پر مستفید ہورہا تھا اور یہی عادلانہ نظام قبولِ اسلام اور تعارفِ اسلام کا سبب بن رہا تھا۔لہٰذا ہمیں چاہیے کہ بطورِ تذکیر علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''الفاروق'' نامی کتاب کا مطالعہ کریں، عہدِ فاروقی کو اپنے محدود دائرۂ کار کے لیے اسوہ بنائیں اور اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھائیں، بلا کسی تذبذب کے شفافیت کو اختیار کریں، تاکہ جواب طلبی تک بات نہ پہنچے، مشورہ کی سنت کو زندہ رکھیں، حسبِ موقع ہفتہ واری، ماہانہ یا سہ ماہی تبادلۂ خیال کا نظم ضرور کریں، شرحِ صدر کے ساتھ مشورہ سنیں اور مقصد کے تئیں مفید مشوروں کو ترجیحاً قبول کریں، کیونکہ مشورہ میں خیر ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا جو اپنے ساتھیوں سے زیادہ مشورہ لیتا ہو۔ (سنن ترمذی: ۱۷۱۴) ہم خواہ کسی کمپنی میں ہوں یا فیکٹری میں، ہم کسی ادارہ میں ہوں یا پھر سوسائٹی میں، ہم ذمہ دار گھر کی سطح پر ہوں یا محلہ کی سطح پر، بہر صورت ہمیں احساسِ مسؤولیت اور شفافیت اختیار کرنی چاہیے۔ اس سے نہ صرف معاشرہ میں سکون اور اعتماد بڑھے گا، بلکہ ہمارا معاشرہ تعارفِ اسلام کا ذریعہ بنے گا اور ہم سب اجر و ثواب کے مستحق بنیں گے۔

☆☆☆

نعت رسول ﷺ

مولانا محمد شعیب احسن اعظمی ندوی

سیاہ حرفوں نے صفحے پہ جاہ پائی ہے
قلم نے نعت نبی میں جو راہ پائی ہے

شعور و شعر کی محفل ہے، میں ہوں، ذکر ترا
یہی سکون کی آخر کو راہ پائی ہے

وہ پاک ذات کہ صدقہ ہے جس کا سارا جہاں
اسی کے صدقے جہاں نے پناہ پائی ہے

نقوش پا نہیں تارے زمیں پہ بکھرے ہیں
انہی سے ہم نے اندھیروں میں راہ پائی ہے

وفا کے جتنے تقاضے ہیں محسن عالم
بہت ہی کم انہیں دنیا نباہ پائی ہے

جو بے نصیب اطاعت ہیں بے نگاہ ہیں وہ
مقام شکر ہے احسنؔ نگاہ پائی ہے

نبی کامل

سیرتِ نبوی ﷺ اور بچوں کی تربیت

مولانا محمد عظیم ندوی (مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی)

حضور اکرم ﷺ کی بچوں کے ساتھ شفقت و محبت سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک نہایت روشن اور دل آویز باب ہے۔ آپ ﷺ کی بچوں کے ساتھ شفقت ومحبت صرف حکم دینے تک محدود نہ تھی، بلکہ آپ ﷺ نے پوری کائنات کے لیے اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا۔ اسلام نے بچوں کو محض گھر کا ایک کمزور فرد نہیں، بلکہ امت کے مستقبل کے لیے امانت قرار دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی سیرت میں اس امانت کی بہترین حفاظت نظر آتی ہے۔

آپ ﷺ بچوں سے اتنی محبت فرماتے کہ ان سے خود سلام کرتے، پیار سے ملتے، گود میں بٹھاتے اور شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے تھے۔

۱۔ آپ ﷺ بچوں کے پاس سے گزرتے تو انہیں سلام کرتے، جس سے ان کے دلوں میں عزت اور اعتماد پیدا ہوتا تھا۔ یہ معمولی سا عمل نہیں، بلکہ پوری کائنات کے لیے ایک عظیم تربیتی پیغام تھا کہ بچے بھی احترام کے مستحق ہیں۔

۲۔ حضور اکرم ﷺ کا حضراتِ حسنین رضی اللہ عنہما کو بوسہ دینے کا ذکر آتا ہے۔ جب ایک بدوی شخص نے کہا کہ ہمارے تو دس بچے ہیں، ہم تو کسی کو بوسہ نہیں دیتے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ محبت کمزوری نہیں، بلکہ ایمان اور رحمت کی علامت ہے۔

۳۔ آپ ﷺ کا بچوں کو گود میں بٹھانا، کندھوں پر سوار کرنا، رخسار پر ہاتھ پھیرنا اور سر پر دست شفقت رکھنا آپ ﷺ کے معمولاتِ زندگی میں شامل تھا۔ آپ ﷺ کا یہ انداز بچوں کے اطمینان، قربت اور جذباتی تحفظ کا سبب بنتا تھا۔

۴۔ جب نوزائیدہ یا کم عمر بچہ آپ ﷺ کی خدمت میں لایا جاتا تو آپ ﷺ اس کے لیے دعا فرماتے اور برکت کی دعا دیتے تھے۔ اس سے واضح ہے کہ آپ ﷺ بچوں کی ظاہری دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ ان کی روحانی ترقی کا بھی اہتمام فرماتے تھے۔

۵۔ آپ ﷺ بچوں کی تربیت بھی فرماتے تھے، مگر سختی اور تحقیر کے بجائے محبت اور شفقت سے کام لیتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بچے آپ ﷺ کے قریب اور مانوس رہتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بیان کے مطابق، حضور اکرم ﷺ بچوں پر سب سے زیادہ مہربان تھے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس کچھ بچے آئے تو آپ ﷺ نے ہر بچے کے رخسار پر ہاتھ پھیرا، جس سے آپ ﷺ کی شفقت سب کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ اسی طرح حضراتِ حسنین رضی اللہ عنہما کا آپ ﷺ کے کندھوں پر سوار ہونا آپ ﷺ کے بچوں کے ساتھ بے تکلف ہونے کی اعلیٰ مثال ہے۔

موجودہ زمانے کے والدین، اساتذہ اور معاشرے کے لیے آپ ﷺ کی سیرت میں بچوں کے تعلق سے بے حد بڑا اور ابدی پیغام ہے کہ بچے صرف نظم وضبط سے نہیں، بلکہ محبت اور شفقت سے سنورتے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ بچوں کے ساتھ رحمت، الفت، محبت اور شفقت کا معاملہ فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کا حکم فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں سخت رخ اپناتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''جو چھوٹوں پر رحم نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔''

گویا اس سے ہمارا کوئی دینی و ایمانی تعلق نہیں۔ اس طرح کا جملہ ایسے نبی ﷺ کی زبان سے نکلنا، جو سراپا رحمت ہیں، بڑا سخت جملہ اور انتہائی سخت وعید ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا معمولِ مبارک یہ تھا کہ آپ ﷺ جب بھی کسی سفر سے واپس ہوتے تو راستے میں کسی نہ کسی بچے کو اپنی سواری پر آگے یا پیچھے بٹھا لیا کرتے تھے اور راستے میں بچوں سے خود سلام فرما لیا کرتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں دس سال کی عمر سے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں رہا اور کئی بار مجھ سے غلطیاں ہوئیں، لیکن آپ ﷺ نے اُف تک نہ فرمایا۔

جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں داخل ہو رہے تھے تو لڑکیاں گلیوں میں آپ ﷺ کے لیے گیت گا رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' تو انہوں نے کہا: ''ہاں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔''

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔ آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو کر گھر کی طرف چلے آئے۔ میں بھی آپ ﷺ کے پیچھے ہولیا۔ ادھر سے کچھ بچے نکل آئے۔ آپ ﷺ نے سب کو پیار کیا، مجھے بھی پیار کیا۔

آج بچوں کے ساتھ تعلیم وتربیت کے نام پر، محبت اور شفقت کے نام پر جو ظلم اور زیادتی ہو رہی ہے، وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ جہاں سخت رویہ اپنانا چاہیے، وہاں ''بچے ہیں'' کہہ کر اپنا دامن جھاڑ لیتے ہیں اور انہیں آزاد چھوڑ دیتے ہیں، اور جہاں محبت اور پیار سے سمجھا بجھا کر کام لینا چاہیے، وہاں ان پر قہر برپا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچے نہ اپنے والدین کی سنتے ہیں، نہ اساتذہ کی اور نہ اپنے سے بڑے لوگوں کی۔

الغرض، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے بچوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے، سیرتِ نبوی ﷺ سے ان کو ہم آہنگ کرایا جائے اور بزرگوں کے بچپن کے واقعات انہیں پڑھ کر سنائے جائیں، تاکہ نئی نسل مستقبل کے لیے ایک عمدہ شاہکار بن سکے۔

بچوں کی تربیت محض ان کی ضروریات پوری کر دینے یا انہیں اچھی تعلیم دلانے کا نام نہیں، بلکہ ان کے دلوں میں ایمان واخلاق اور ادب وسلیقہ پیدا کرنا بھی تربیت کا بنیادی حصہ ہے۔ والدین اور اساتذہ اگر نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر بچوں سے معاملہ کریں، ان کی غلطیوں کی اصلاح محبت اور حکمت کے ساتھ کریں، ان کی بات سنیں، ان کی عزتِ نفس کا خیال رکھیں اور انہیں اپنے عمل سے اچھائی کا نمونہ دکھائیں تو یقیناً ان کی شخصیت زیادہ متوازن اور مضبوط بن سکتی ہے۔

ہمیں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ آج کے بچے ہی کل کے والدین، اساتذہ، قائدین اور معاشرے کے ذمہ دار افراد ہوں گے۔ آج ہم ان کے دلوں میں جو کچھ بوئیں گے، کل اسی کی فصل ہمارے سامنے ہوگی۔ اگر ان کے دلوں میں محبت، ایمان اور انسانیت کے بیج بوئے جائیں گے تو ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جس میں رحم، احترام اور باہمی تعاون کی فضا ہوگی۔

اس لیے ہمیں چاہیے کہ بچوں کو صرف اپنا تابع بنانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ انہیں اچھا انسان اور صالح مسلمان بنانے کی فکر کریں۔ ان کے لیے نبی کریم ﷺ کی محبت کو زندگی کا سرمایہ بنائیں اور اپنے کردار وعمل سے انہیں یہ سکھائیں کہ حقیقی عظمت دوسروں پر غلبہ پانے میں نہیں، بلکہ دوسروں کے لیے رحمت بننے میں ہے۔ یہی سیرتِ نبوی ﷺ کا پیغام ہے اور یہی ہماری نئی نسل کے لیے سب سے قیمتی تحفہ ہے۔

☆☆☆

بقیہ: کیا عورت کو ناقص العقل کہنا اس کی تحقیر ہے؟

لیکن اسے حدیث کے اصل مفہوم کے خلاف قطعی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ کسی نص کے غلط یا متعصّبانہ استعمال اور اس نص کے اصل مفہوم میں فرق کرنا ضروری ہے۔ حدیث کے سیاق میں ''نقصِ عقل'' اور ''نقصِ دین'' کی خود نبوی توضیح موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عورت کی مطلق انسانی، علمی یا اخلاقی کم تری مراد نہیں۔ لہٰذا اگر بعض لوگوں نے اس حدیث کو عورت کی تحقیر کے لیے استعمال کیا تو قابلِ تنقید چیز ان کی تعبیر اور تطبیق ہے، نہ کہ محض اس استعمال کی بنیاد پر حدیث کو تحقیرِ نسواں کی نص قرار دینا۔

اگر حدیث کا لازمی نتیجہ عورت کی علمی اور سماجی تحقیر ہوتا تو حضرت عائشہؓ جیسی شخصیت کی علمی حیثیت کو سمجھنا مشکل ہوتا۔ حضرت عائشہؓ سے صحابہؓ اور تابعین نے حدیث، فقہ اور دیگر مسائل میں استفادہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''نقصِ عقل'' کو مسلم علمی روایت میں عورت کی ہر قسم کی علمی اہلیت کی نفی کے طور پر نہیں سمجھا گیا۔

اسلام میں انسانی قدر کا معیار جنس نہیں

اگر کوئی شخص اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ عورت بحیثیت انسان مرد سے کمتر ہے تو یہ قرآن کے متعدد بنیادی اصولوں سے ٹکراتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (حجرات: ۱۳) اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ إِنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ (آل عمران: ۱۹۵) میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا، خواہ مرد ہو یا عورت۔

اس لیے اسلامی تصور میں عورت کی انسانی قدر ومنزلت کو ''نقصِ عقل ودین'' سے اخذ کرنا درست نہیں ہے۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ حدیث ''ناقصات عقل و دین'' کی تعبیر اور اس کے سیاق کو سمجھنے میں کہیں نہ کہیں لغوی اور تفسیری سطح پر غلطی ہوئی ہے۔ خصوصاً عربی مادہ ''نقص'' اور اردو کے عرفی لفظ ''ناقص'' کے مفہوم میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا؛ اردو میں ''ناقص'' عموماً عیب دار یا کم تر کے معنی دیتا ہے، جبکہ عربی ''نقص'' کسی مخصوص وصف یا مقدار میں کمی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

دوسری طرف، عورت کی تحقیر کو اس حدیث کا مقصود قرار دینا اسلام کے مجموعی مزاج سے بھی ہم آہنگ نہیں، کیونکہ اسلام کے نمایاں کارناموں میں عورت کو اس کے جائز حقوق دینا، اس کی انسانی عزت وحرمت کو تسلیم کرنا اور اسے معاشرے میں باوقار مقام عطا کرنا شامل ہے۔ اس لیے اس حدیث کو عورت کی عمومی ذہنی یا انسانی کم تری کے مفہوم میں لینے کے بجائے اس کے اصل عربی مفہوم، سیاقِ حدیث اور نبوی توضیح کی روشنی میں سمجھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

☆☆☆

فصل بہاراں

ماہِ ربیع الاول اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مولانا عبدالحی حسنی ندوی (تکیہ کلاں رائے بریلی)

ماہِ ربیع الاول اسلامی سال کا تیسرا اور نہایت بابرکت مہینہ ہے۔ یہ مہینہ امتِ مسلمہ کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی مبارک مہینے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا میں جلوہ گر فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری پوری انسانیت کے لیے رحمت، ہدایت اور نجات کا سرچشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔) (سورۃ الانبیاء: ۱۰۷)

ماہِ ربیع الاول ہمیں صرف رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کی یاد ہی نہیں دلاتا، بلکہ یہ اس بات کی دعوت بھی دیتا ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں، اس کی تعلیمات کو سمجھیں اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالیں۔ درحقیقت اسلام کی حقیقی روح، قرآنِ کریم کے عملی مفہوم اور دینی تعلیمات کے صحیح فہم کا بہترین ذریعہ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

سیرتِ طیبہ انسان کے دل میں ایمان کی تازگی پیدا کرتی ہے، اسے غور وفکر کی دعوت دیتی ہے، مقصدِ حیات سے روشناس کراتی ہے، مشکلات کا صبر واستقامت کے ساتھ مقابلہ کرنا سکھاتی ہے، رحم وشفقت، ایثار اور ہمدردی کے جذبات پروان چڑھاتی ہے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور معاشرت کے آداب سکھاتی ہے، بڑوں کے احترام اور چھوٹوں پر شفقت کی تعلیم دیتی ہے، اور انسان کو اپنے محدود دائرۂ فکر سے نکال کر پوری انسانیت کی خیرخواہی کا سبق دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الأحزاب: ۲۱) (یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری حیاتِ مبارکہ انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ عبادات ہوں یا معاملات، اخلاق ہوں یا معاشرت، تجارت ہو یا سیاست، عدل وانصاف ہو یا قیادت، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہترین رہنمائی نہ فرمائی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات قیامت تک آنے والی تمام انسانیت کے لیے ہدایت کا کامل سرچشمہ ہیں۔

حسنِ اخلاق

اسلام کی بنیاد اعلیٰ اخلاق پر قائم ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا (ایمان کے اعتبار سے کامل ترین مومن وہ ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں)

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ صَالِحَ الْأَخْلَاقِ (مجھے بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت نرم دل، بردبار، سچے، دیانت دار، رحم دل اور انصاف پسند تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسنِ اخلاقِ نبوی سے متاثر ہوکر بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ نبوت سے پہلے بھی اہلِ مکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "الصادق" اور "الامین" کے مبارک القابات سے یاد کرتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ (سچائی کو لازم پکڑو، کیونکہ سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے، اور نیکی جنت تک پہنچاتی ہے۔) (بخاری)

رحم، عفوودرگزر

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی سراپا رحمت تھی۔ آپ نے نہ صرف اپنے ماننے والوں بلکہ اپنے سخت ترین دشمنوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک فرمایا۔ فتحِ مکہ کے موقع پر، جب دشمن مکمل طور پر آپ کے سامنے بے بس تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ (جاؤ! تم سب آزاد ہو۔)

یہ اعلان تاریخِ انسانیت میں عفو و درگزر، رحم دلی اور اعلیٰ ظرفی کا ایک غیر معمولی مظہر ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، ارْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ۔" (رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔) (ترمذی)

صبرواستقامت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوتِ اسلام کے راستے میں بے شمار مصائب وآلام برداشت کیے، مگر کبھی صبر اور ثابت قدمی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ طائف میں جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتھر مارے گئے اور جسمِ اطہر لہولہان ہوگیا، تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بددعا کے بجائے---

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

شمع فروزاں

پیکرِ اخلاق اور کامل دستورِ حیات

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

انسانی تاریخ کے وسیع آسمان پر بے شمار عظیم شخصیات کے روشن ستارے نظر آتے ہیں؛ لیکن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ اقدس ایسی جامع، کامل اور عالمگیر شخصیت ہے جس کی روشنی کسی ایک قوم، نسل، خطے یا زمانے تک محدود نہیں۔ آپ ﷺ پوری انسانیت کے لیے ہادی، مربی، محسن اور رحمت للعالمین بنا کر مبعوث کیے گئے۔

آپ ﷺ کی بعثت انسانیت پر اللہ تعالیٰ کا سب سے عظیم احسان ہے۔ آپ ﷺ ایسے زمانہ میں تشریف لائے جب دنیا جہالت، شرک، ظلم، طبقاتی امتیاز، قبائلی تعصب اور اخلاقی زوال میں مبتلا تھی۔ آپ ﷺ نے توحید کا پیغام دے کر انسان کو انسان کی غلامی سے نکالا اور ایک اللہ کی بندگی کی آزادی عطا کی۔ آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ انسان کی اصل عزت اس کے رنگ، نسل، خاندان، مال اور منصب میں نہیں بلکہ تقویٰ اور کردار میں ہے۔

محمد عربی ﷺ نے انسان کو صرف اللہ کی عبادت کا طریقہ نہیں سکھایا؛ بلکہ زندگی گزارنے کا ایک مکمل، متوازن اور پاکیزہ نظام عطا فرمایا۔ آپ ﷺ مسجد میں عابد، میدانِ عمل میں بہادر، عدالت میں عادل، معاملات میں صادق و امین، گھر میں شفیق و محبت کرنے والے، بچوں کے لیے مہربان، غریبوں اور مسکینوں کے لیے سہارا اور کمزوروں کے لیے پناہ تھے۔ یہی آپ ﷺ کی جامع شخصیت کا کمال ہے کہ زندگی کا کوئی اہم شعبہ آپ ﷺ کی رہنمائی سے خالی نہیں۔

آپ ﷺ نے انسان کو عزتِ آدمیت کا شعور عطا کیا۔ عورت کو عزت و حقوق دیے، یتیم اور مسکین کی کفالت کی ترغیب دی، غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا، پڑوسی کے حقوق بیان کیے اور معاشرے میں اخوت و مساوات کی بنیاد قائم کی۔ آپ ﷺ نے تجارت میں دیانت، معاملات میں امانت، وعدوں کی پابندی، ناپ تول میں انصاف اور کمزوروں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی۔ آپ ﷺ نے ظلم، دھوکے، خیانت، تکبر اور استحصال سے روکا اور عدل، رحم، عفو اور خدمتِ خلق کو انسانی عظمت کا حصہ بنایا۔

آپ ﷺ کی رحمت صرف انسانوں تک محدود نہ تھی؛ بلکہ جانوروں اور تمام مخلوقات کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم بھی آپ ﷺ نے دی۔ یوں آپ ﷺ کی تعلیمات فرد سے خاندان، خاندان سے معاشرے اور معاشرے سے پوری انسانیت تک خیر اور رحمت کا پیغام پہنچاتی ہیں۔

آپ ﷺ کی زندگی قرآن کی عملی تفسیر تھی۔ آپ ﷺ نے جو تعلیم دی، اسے سب سے پہلے اپنی ذات پر نافذ کیا۔ اسی لیے آپ ﷺ کی سیرت محض نظری تعلیمات کا مجموعہ نہیں؛ بلکہ ایک زندہ اور عملی نمونہ ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی میں صبر بھی ہے اور شکر بھی، عبادت بھی ہے اور خدمت بھی، عفو بھی ہے اور عدل بھی، محبت بھی ہے اور حکمت بھی، قیادت بھی ہے اور عاجزی بھی۔ فتح و اقتدار کے وقت آپ ﷺ متواضع رہے اور مصیبت و آزمائش کے وقت صابر و ثابت قدم۔

آج انسان نے سائنس، ٹیکنالوجی اور مادی ترقی کے میدان میں بے مثال کامیابیاں حاصل کی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود دنیا اخلاقی بحران، خاندانی انتشار، نفرت، ظلم، خودغرضی، ذہنی بے سکونی اور معاشرتی ناانصافی جیسے مسائل سے دوچار ہے۔

ایسے دور میں سیرتِ نبوی ﷺ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ آج ایک اچھے خاندان کی ضرورت ہے تو ہمیں رسول اللہ ﷺ کے گھریلو اخلاق سے رہنمائی لینی ہوگی۔ ایک پاکیزہ معاشرہ مطلوب ہے تو آپ ﷺ کی عدل و رحمت کی تعلیمات اپنانی ہوں گی۔ کاروبار میں برکت چاہیے تو صداقت و امانت کو اختیار کرنا ہوگا۔ بچوں اور نوجوانوں کی صحیح تربیت مطلوب ہے تو آپ ﷺ کے شفقت بھرے تربیتی اسلوب کو اپنانا ہوگا۔ قیادت اور حکمرانی میں اصلاح چاہیے تو آپ ﷺ کے عدل، مشاورت، امانت اور خدمت کے اصولوں سے رہنمائی لینا ہوگی۔

محمد ﷺ سے محبت ہر مسلمان کے ایمان کا سرمایہ ہے؛ لیکن محبت کا تقاضا صرف زبان سے درود و سلام پڑھنا نہیں؛ بلکہ آپ ﷺ کے طریقے کو اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔

اگر ہم آپ ﷺ کی سیرت کو حقیقی معنوں میں اپنانا چاہتے ہیں تو ہماری زبان میں صداقت، معاملات میں امانت، دل میں رحم، رویے میں نرمی، فیصلوں میں عدل، گھر میں محبت اور معاشرے میں خیرخواہی نظر آنی چاہیے۔

حقیقی عاشقِ رسول وہ ہے جس کے کردار سے اخلاقِ محمدی ﷺ کی خوشبو محسوس ہو، جس کی ذات سے دوسروں کو امن ملے اور جس کی زندگی سنتِ رسول ﷺ کی عملی تصویر بن جائے۔

محمدِ عربی ﷺ کی سیرت ایک ایسا روشن چراغ ہے جس سے قیامت تک آنے والی انسانیت رہنمائی حاصل کرسکتی ہے۔ آپ ﷺ نے انسان کو اس کے رب سے جوڑا، اسے اس کی حقیقی عزت سے آشنا کیا، زندگی کا مقصد بتایا اور دنیا و آخرت کی کامیابی کا راستہ دکھایا۔

آپ ﷺ رحمت للعالمین ہیں؛ آپ ﷺ کی تعلیمات میں فرد کی اصلاح بھی ہے، خاندان کی تعمیر بھی، معاشرے کی فلاح بھی اور پوری انسانیت کے امن و عدل کا پیغام بھی۔

آج ضرورت اس بات کی نہیں کہ ہم صرف سیرتِ رسول ﷺ کے جلسے اور محفلیں منعقد کریں، بلکہ ضرورت یہ ہے کہ سیرت کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں؛ اپنے اخلاق کو سنواریں، اپنے گھروں کو محبت کا مرکز بنائیں، اپنے معاملات کو امانت و دیانت سے آراستہ کریں اور اپنے معاشرے میں عدل و رحمت کو فروغ دیں؛ کیونکہ محمد ﷺ کی محبت کا سب سے خوب صورت ثبوت یہی ہے کہ ہماری زندگی میں محمد ﷺ کے اخلاق، آپ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کی رحمت نظر آنے لگے۔

یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی کارنامہ ہے۔ جس نے انسانی معاشرہ کو بدل کر رکھ دیا۔ تہذیب و تمدن کے تمام اداروں اور شعبوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی، اس انداز سے کہ ہر طرف خیر و اصلاح ہے۔ کہیں فساد نہیں، شر و فتنہ نہیں، بگاڑ نہیں، ہر لحہ ارتقا ہے، آپؐ نے ایک نئی تاریخ کا افتتاح فرمایا۔ یہ اتنا عظیم کارنامہ ہے جس کی نظیر دنیا میں ممکن ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ بنی نوع انساں کو ہدایت عطا فرمائے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

انسان کے افکار و خیالات کا سرچشمہ

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی

آج اگر ہم معاشرۂ انسانی پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو لوگوں کو فواحش و منکرات میں مبتلا پاتے ہیں، عیاری، مکاری اور جعل سازی میں وہ اتنے بڑھ چکے ہیں کہ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے، ایسے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہمیں یاد آتی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ: خبردار! جسم انسانی میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ درست رہتا ہے تو پورا جسم درست رہتا ہے، اور اگر وہ بگڑ جاتا ہے تو پورے جسم کا نظام بگڑ جاتا ہے، سن لو! وہ دل ہے۔

درحقیقت قلب ہی انسان کے افکار و خیالات کا سرچشمہ ہے، وہ خوشی و ناراضگی، صلاح و فساد، نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے اور محبت و عداوت کے اظہار کا مرکز ہے، اسی وجہ سے اس کی طہارت و نظافت کا خیال رکھنا، اس کو اطمینان و سکون بہم پہونچانا بے حد ضروری ہے، اس حقیقت سے دنیا کے اکثر انسان نا آشنا ہیں، حتی کہ عالمی فلسفوں اور مختلف تہذیبوں کے متوالے بھی اس سے ناواقف ہیں، انہیں اس کی بھی خبر نہیں کہ تہذیب کی تعمیر و تخریب میں اس کا کیا کردار رہا ہے، اس کردار سے عدم واقفیت ہی نے یورپ کے باشندوں کو دل کا مریض بنا دیا ہے، جس کی وجہ سے وہاں کثرت سے دل کے دورے پڑتے ہیں، بالآخر وہ اس کی سرجری کرتے ہیں، اور فطری طریقے سے اس کو خون فراہم کرنے کا راستہ بناتے ہیں۔

امراض قلب کے بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ اللہ کے ذکر سے ہی قلب کو تمام بیماریوں سے پاک وصاف رکھا جاسکتا ہے، جو بندہ صدق دل سے اللہ کے سامنے روتا اور گڑگڑاتا ہے اس کو قلب کی ظاہری و باطنی کوئی بیماری نہیں لاحق ہوتی ہے۔ دینی اعتبار سے قلب ایمان و ایقان کا مرکز ہے، وہ کبھی کبھی اخلاقی امراض پر بندش لگانے اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں ہاتھ اور زبان کا نمائندہ ہوتا ہے، اسی طرح جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ تم میں سے اگر کوئی شخص برائی دیکھے تو ہاتھ سے ختم کرنے کی کوشش کرے، اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو زبان کے ذریعہ اس کو ختم کرے، اگر اس کی بھی استطاعت نہیں رکھتا، تو دل سے اس کو برا سمجھے، اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔

بعض لوگوں نے صرف یہ سمجھ رکھا ہے کہ دل صرف رگوں تک خون سپلائی کرنے کا آلہ ہے، اسی پر اعتماد کر کے انہوں نے قلب کی فعالیت اور تاثیر سے چشم پوشی کی اور اس کو صاف و ستھرا رکھنے کے وسائل فراہم نہیں کیے، چنانچہ وہ خسارہ میں رہے، دل کو صرف رگوں اور جسم کے پورے حصے میں خون پہونچانے کا آلہ سمجھنا، ذکر و اذکار سے اس کو پاک نہ کرنا اور اس کے قائدانہ کردار سے تغافل برتنا یہ سب غیر دانشمندانہ اور غیر اسلامی اعمال ہیں اور اسلام قطعاً اس کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ وہ تو ذکر و اذکار، توجہ و انابت الی اللہ میں مشغول رکھنے کا حکم دیتا ہے، کیونکہ ان کے ذریعہ انسان کو فکری و روحانی غذا ملتی ہے۔

☆☆

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

حرف سے آگہی تک

مفتی سراج الہدیٰ ندوی ازہری

اعلیٰ طباعت کی مثال، ۲۴۰؍صفحات کی یہ کتاب' مفتی سراج الہدیٰ ندوی ازہری (استاذ دارالعلوم سبیل الرشاد، حیدرآباد) کے ۳۲؍مضامین کا مجموعہ ہے، جو وقفہ وقفہ سے اخبارات ومجلّات میں شائع ہوتے رہے ہیں، اور مختلف فکری، ادبی اور اصلاحی موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔

مفتی صاحب موصوف کے بارہ میں کہا جائے کہ وہ ایک کہنہ مشق قلم کار ہیں تو شاید غلط نہ ہو؛ کیونکہ انھوں نے طالب علمی کی نوخیز عمری سے جو قلم اٹھایا تو مشقِ سخن تاہنوز جاری ہے، اور خوبی کی بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی نگارشات کا ایک بڑا حصہ محفوظ رکھا ہے، اور اب افادۂ عام کے لئے اس کی طباعت کی فکر کر رہے ہیں۔ کتاب کا عنوان بھی اس بات کا پتہ دے رہا ہے کہ یہ مضامین نوعمری سے لے کر وقتِ حاضر تک کے ایک لمبے تحریری سفر کی یافت ہیں۔

کل مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے؛ پہلا حصہ ''اسلامیات'' کا ہے، جس میں احکام، مسائل، اخلاق اور قرآنیات کا ذکر ہے۔ دوسرا حصہ ''ادبیات'' کا ہے، جس میں اردو، اردو صحافت اور اردو شعروشاعری کے علاوہ ''قرآن کا حکایتی اسلوب'' اور ''غار والوں کے قصہ کا تربیتی پہلو'' جیسے موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرا حصہ ''فکریات'' کا ہے، جس میں ملکی سیاست، عالمِ اسلام، اور مسلم معاشرتی مسائل وغیرہ امور بیان کیے گئے ہیں۔

مولانا موصوف کا قلم پاکیزہ، سنجیدہ، باوقار اور سلیس ہے، وہ مستند حوالوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں اچھا تاثر پیدا کرتی ہیں، اور عمل کی دعوت دیتی ہیں۔

'مکتبۃ النور' دیوبند سے شائع ہوکر خرید کے لیے دستیاب ہے۔ حصول کے لئے رابطہ کریں: ۷۶۶۸۳۸۱۱۹۲

موت کے بعد

مصعب عثمان قریشی ندوی

آج انسانی معاشرہ کی خرابی اور فساد کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنے وجود وہستی کے مقصد کو بھول گیا ہے، اور اس دنیوی زندگی کے صحیح تصور سے ناواقف ہے۔ اس نے اس وجود اور اس زندگی کو ہی کل سمجھ لیا ہے، اور موت کے بعد آنے والی زندگی سے بالکل غافل ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے افکار واعمال سب اسی عارضی مقاصد اور وقتی اغراض کے لیے ہیں، اور آخرت کی زندگی، حساب کتاب، حشر ونشر، کسی پر اس کی نگاہ نہیں ہے۔ نتیجۃً ایک ایسا انسانی معاشرہ وجود میں آچکا ہے جس میں حقوق پامال ہیں، اخلاق برباد ہیں، اور خیالات' خودغرضی اور خودپرستی پر مبنی ہیں، اور احساسِ جواب دہی ناپید ہے۔

اسی احساس کو جگانے کے لیے جناب مصعب عثمان قریشی ندوی صاحب نے اپنے زورِ قلم کو آزمایا ہے، اور ان کے شگفتہ قلم سے ایک مفصل کتاب اس موضوع پر نکل کر منصۂ شہود پر آئی ہے، جو ''موت کے بعد۔ نئی دنیا، نئی زندگی'' کا درخشاں عنوان اپنے سرِ ورق پر رکھتی ہے۔ مصعب عثمان صاحب' جناب قاری عثمان قریشی صاحب کے صاحبزادہ ہیں، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دفترِ اہتمام میں ملازم تھے، اور شہرِ لکھنؤ کی معروف شخصیات میں شمار ہوتے تھے، یہ کتاب انہی کی تعلیم وتربیت کا ثمرِ بار آور ہے، جس کی وجہ سے مصعب صاحب نے اس کا انتساب انہی کی طرف کیا ہے۔

اچھی طباعت وکتابت والی یہ کتاب جو تقریباً ۱۹۰؍صفحات کی ضخامت رکھتی ہے، ہم کو بتلاتی ہے کہ انسان وکائنات کی تخلیق کیسے ہوئی، اس کا کیا مقصد تھا، خلافت فی الارض کے کیا معنی ہیں، ابنِ آدم سے مطالبہ کس بات کا ہے، کائنات کس کے لیے بنی ہے، خلافت واطاعت کی راہ میں کس طرح شیطان ایک رکاوٹ ہے، قیامت کیوں ہے، اس کا کیا ثبوت ہے، آخرت کیوں ہے؟۔ اور پھر آخرت کا اثبات آیات واحادیث کی روشنی میں کر کے' حشر ونشر کی تصویر کشی قرآنی آیات کے ذریعہ کرتی ہے، اور آگے چل کر بتاتی ہے کہ روزِ آخرت پر ایمان کے انسانی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور میدانِ حشر میں بوقت حساب کتاب انسان کتنا بے بس ولاچار ہوگا......

الغرض یہ کتاب ابتدائے آفرینش سے لے کر منتہائے آخرت تک کے تمام مراحل وادوار کا صحیح اسلامی تصور، صحیح مصادر سے پیش کر کے سوئے ہوئے انسانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ فکر وعمل کی دعوت دیتی ہے۔

گرچہ کتاب کافی عرصہ ہوئے تیار ہوچکی تھی، اور اس پر سابق ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا

سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقدمہ اور سابق ناظرِ عام ندوۃ العلماء مولانا سید حمزہ حسنی رحمہ اللہ کی تقریظ بھی ہے؛ لیکن قضاء وقدر میں ہر کام کے لیے وقت طے ہے، سو دیر آید درست آید کے مصداق اب یہ قابلِ قدر کتاب 'مکتبہ احسان، لکھنؤ' میں طباعت کے زیور سے آراستہ ہوکر خرید واستفادہ کے لیے دستیاب ہے، اور ہم امید کرتے ہیں مصعب صاحب کی یہ کاوش 'اصلاحِ معاشرہ' میں ایک اچھا کردار ادا کرے گی، اور ان کے میزانِ حسنات میں شامل ہوگی۔

لکھنؤ کے معروف کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے، حصول کے لیے رابطہ نمبر درج ذیل ہے:

۹۷۹۳۱۱۸۲۳۴

☆☆☆

نالۂ درد

نتیجۂ فکر:- مولانا عبدالسبحان ندوی (کولکاتا)

سراپا درد ہوں، نالہ رسا، آہ وفغاں ہوں میں
ستم یہ ہے زباں ہوتے ہوئے بھی بے زباں ہوں میں

بڑی قربانیاں دی تھیں مرے اسلاف نے لیکن
صلہ مجھ کو ملا یہ ہے کہ گردِ رائیگاں ہوں میں

پڑے ہیں جان کے لالے کبھی ایمان کے لالے
سراپا کھو گیا میرا، پسِ پردہ دھواں ہوں میں

زبانیں کاٹ دی جائیں حقیقت چھپ نہیں سکتی
ہزاروں داستانوں میں حقیقی داستاں ہوں میں

گیا وہ دور جب موجود تھا ہر جا نشاں میرا
یہ کیسا دور ہے ندوی کہ بے نام ونشاں ہوں میں

بقیہ: ماہِ ربیع الاول اور سیرتِ نبوی ﷺ

۔۔ ان کی ہدایت کی دعا فرمائی۔ یہی سیرتِ نبوی ﷺ کا عظیم ترین سبق ہے کہ مصیبتوں اور مخالفتوں کے باوجود حلم، صبر اور حسنِ اخلاق کو اختیار کیا جائے۔

عدل وانصاف

اسلام میں عدل وانصاف ہر شخص کے لیے یکساں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس پر بھی اللہ کی مقرر کردہ حد نافذ کرتا۔" (بخاری)

یہ ارشاد اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اسلام میں قانون سب کے لیے برابر ہے اور کسی کو نسب، منصب یا دولت کی بنیاد پر کوئی امتیاز حاصل نہیں۔

عبادت اور اللہ تعالیٰ سے تعلق

رسول اللہ ﷺ راتوں میں طویل قیام فرمایا کرتے تھے، قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے اور نہایت عاجزی وانکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے تمام گناہ معاف فرما دیے ہیں، پھر آپ اتنی عبادت کیوں کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا (کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟) (صحیح بخاری)

محبتِ رسول ﷺ

رسول اللہ ﷺ سے محبت ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اپنے والد، اپنی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ رکھوں) (بخاری)

محبتِ رسول ﷺ کا تقاضا صرف زبانی دعویٰ نہیں، بلکہ آپ ﷺ کی سنتِ مبارکہ کی اخلاص کے ساتھ پیروی کرنا اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔

ربیع الاول کا حقیقی پیغام

ماہِ ربیع الاول کا اصل تقاضا یہ ہے کہ ہم:

قرآنِ کریم کی تلاوت کریں اور اس پر عمل کریں۔

سیرتِ نبوی ﷺ کا مستقل اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں۔

درودِ پاک کی کثرت کریں۔

نمازوں کی پابندی کریں۔

والدین، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق ادا کریں۔

سچائی، امانت داری، عدل وانصاف اور حسنِ اخلاق کو اپنی زندگی کا شعار بنائیں۔

غریبوں، یتیموں اور ضرورت مندوں کی مدد کریں۔

لغویات اور گناہوں سے بچیں۔

ہر معاملے میں سنتِ رسول ﷺ کی پیروی کی کوشش کریں۔

ماہِ ربیع الاول صرف خوشی کے اظہار، اجتماعات یا محافل کے انعقاد تک محدود نہیں، بلکہ یہ ایمان کی تجدید، سیرتِ نبوی ﷺ کے گہرے مطالعے، سنتِ نبوی ﷺ کی عملی پیروی اور اپنی زندگی کو اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھالنے کا مہینہ ہے۔

آج امتِ مسلمہ کو جن اخلاقی، معاشرتی اور فکری چیلنجز کا سامنا ہے، ان کا حقیقی حل سیرتِ رسول ﷺ میں مضمر ہے۔ اگر ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں آپ ﷺ کی تعلیمات کو نافذ کرلیں تو ہمارے گھروں، معاشرے اور پوری امت میں امن، محبت، عدل، اخوت اور باہمی اعتماد کی فضا قائم ہوسکتی ہے۔

☆☆☆

رہبر کامل

امتیازاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

نظام کائنات میں ردِ عمل قانون فطرت سے وابستہ ہے، جب رات کی سیاہی اپنا دامن پھیلا دیتی ہے تو روز روشن کا انتظار ہوتا ہے، خزاں کو دیکھ کر بہار کی امیدیں بھی قائم ہوتی ہیں، چاند ستاروں کے غائب ہوتے ہی آفتاب کی کرنیں نمودار ہونے لگتی ہیں، جب عالم کون وفساد انسانیت سوز کردار سے مجروح ہوجاتا ہے، کذب و بطلان کی کالی گھٹائیں انسانی دل ودماغ پر چھا جاتی ہیں، عالم بالا تک پرواز کرنے والی ہستی اپنے اعمال کی نحوست سے تحت الثریٰ کے دلدل میں پھنس جاتی ہے، خلیفہ خدا اپنے حدود کو پھلانگ کر مالک حقیقی سے دور بھاگنے لگتا ہے، عدل و انصاف، رحم وکرم، عفو ولطف کی بہاریں خزاؤں میں تبدیل ہوجاتی ہیں، بدیوں کی، نافرمانیوں کی، بغاوتوں کی ظلمتیں محیط تر ہوتی جاتی ہیں تو آفتاب ہدایت بھی نمودار ہوتا ہے، شرک وکفر کی خزاں زدہ بستی میں بہار نبوت رونق افروز ہوتی ہے، نوع بشر کی بگڑی ہوئی فطرت اور انسانیت کی مسخ ہوتی صورت کو صحیح روپ میں پیش کرنے کے لیے، بکھرے ہوئے انسانی شیرزاہ کے تانے بانے کو جوڑنے اور در بدر سر پٹکتی مخلوق کو حقیقی معبود کی چوکھٹ پر سرنگوں کرنے کے لیے ایک ایسی ہستی کی بعثت ہوتی ہے جو انسانی اوصاف حمیدہ کی پیکر ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ عزم واستقلال، حلم ومعرفت اور رحمت ورأفت کی حامل ہوتی ہے، اس سے وہ اعمال صادر ہوتے ہیں جو ہمارے فہم وادراک سے پرے ہیں، چاند اس کے ایک اشارہ پر اپنی فطرت بدل دیتا ہے، پتھر اسے دیکھ کر بول پڑتے ہیں، اس کے نفس پاک سے بیمار صحتیاب ہوجاتے ہیں، اس کی انگلی سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں، اس جیسے نہ جانے کتنے معجزے ہیں جو منصۂ وجود پر رونما ہوتے ہیں اور اس نبی مرسل کی رسالت اور خدا کی کارسازی کی گواہی دیتے ہیں۔

خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ رب العزت نے وہ امتیازات عطا کیے جو پورے نوع انسانی کیا کسی خاص پیغمبر کے حصہ میں بھی نہیں آئے ہوں گے، انبیاء کرام اپنے اپنے وقت کے سب اعلیٰ و افضل تھے، رب کائنات کے منتخب بندے تھے، صفی اللہ بھی تھے، نجی اللہ بھی تھے، خلیل اللہ، کلیم اللہ اور روح اللہ بھی تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اقدس ان تمام اوصاف وکمالات سے مزین ہوکر "حبیب اللہ" تھی، اس محبوب کی تھی جس کی محبت کی گواہی سارے انبیاء نے دی، رب ذوالجلال نے اپنے محبوب پر بے حد وبے شمار انعامات واکرامات کیے، اور ان کا تذکرہ اپنے لافانی کلام میں محبت و اپنائیت اور حجت ووضاحت کے ساتھ کیا۔

رسولِ انسانیت

دیگر انبیاء کرم کی بعثت محدود قوم کے لیے اور محدود وقت کے لیے ہوا کرتی تھی، کسی کی بعثت نہ عالمگیر تھی اور نہ دائمی تھی، یہ امتیاز صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کی بعثت پوری انسانیت کے لیے ہوئی، تاقیامت ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر بحیثیت نبی ایمان لائے اور آپ کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں نافذ کرے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جابجا یہ بات واضح کردی گئی:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعاً الَّذِيْ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ﴾ آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، اس اللہ کا جس کے لیے زمین وآسمان کی کل بادشاہت ہے)

﴿وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولاً وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْداً﴾ (ہم نے آپ کو انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور گواہی کے لیے تنہا اللہ کافی ہے)

﴿تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْراً﴾ (بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فیصلہ کن کتاب اتاری تاکہ وہ بندہ کل جہانوں کے لیے ڈرانے والا بن جائے)

رحمتِ کائنات

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات مبارک سراپا رحمت تھی، رحمت کسی خاص زوایہ یا نکتہ نظر سے نہ تھی بلکہ رحمت کی جتنی شکلیں اور وسعتیں ہوسکتی ہیں وہ سب آپ کی ذات سے بدرجہ اتم وابستہ تھیں، اور جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کسی خاص قوم یا خطہ کے ساتھ خاص نہیں تھی، اسی طرح آپ کی ردائے رحمت میں پوری انسانیت سمائی ہوئی تھی، دنیا کے کسی بھی خطہ، کسی بھی قوم یا کسی بھی ذات وبرادری کا انسان رسول رحمت کی نبوت کے اقرار کے بعد دونوں جہاں کی رحمتوں کا حقدار ہوجاتا ہے، نہ کوئی بھید بھاؤ نہ کوئی امتیاز! جنھوں نے آپ کو ایذائیں پہنچائیں، آپ کو لہولہان کیا، آپ کے دندان مبارک کو شہید کیا، آپ کے ساتھ جنگیں لڑیں، آپ کے اصحاب کو بے دردی سے قتل کیا وہ سب بھی رحمت کی اس صلائے عام سے محروم نہیں:

﴿وَمَآ أَرْسَلْنٰکَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ﴾ (ہم نے آپ کو کل جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

﴿وَمَآ أَرْسَلْنٰکَ إِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَنَذِيْراً﴾ (ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے)

پوری انسانیت کا درد

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے رسول اور تمام انسانوں کے لیے رحمت ہیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں کل انسانیت کا درد بھرا ہوا تھا، آپ پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے تڑپتے اور بے قرار رہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہا درجہ کی خواہش یہ تھی کہ ایک انسان بھی خدائی عذاب میں مبتلا نہ ہو، گویا آپ کا بس چلتا تو تمام انسانوں کو زبردستی ہی سہی ایمان میں داخل کر دیتے، گویا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کی ایک کیفیت ہے جسے قرآن کریم نے بہت وضاحت سے بیان کیا ہے:

﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّکَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعاً أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (اور اگر آپ کا رب چاہتا تو زمین میں جتنے لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں کو اس حد تک مجبور کریں گے کہ وہ ایمان لے ہی آئیں)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کافروں کی ہدایت کے لیے بھی مضطرب و بیقرار رہتے تھے جو آپ کی جان کے درپے تھے، جو کسی بھی حال میں آپ کو پنپتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے تھے، ایسے سرکش و ظالم لوگوں کے لیے آپ کی جو بے چینی تھی اس کو قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے:

﴿إِن تَحْرِصْ عَلَى هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُضِلُّ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِيْنَ﴾ (اگر آپ کو ان کی ہدایت کی بے پناہ خواہش ہے تو یہ سن لیں کہ اللہ جن کو گمراہ کرتا ہے ان کو ہدایت سے نہیں نوازتا ہے اور ایسوں کی مدد کرنے والے بھی کوئی نہیں ہوگا)۔

﴿وَمَآ أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ (آپ کو جس قدر شدید خواہش ہو لوگوں کی اکثریت ایمان نہیں لانے والی ہے)۔

ہر ہر فرد بشر کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے چینی و بے کلی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کڑھن اتنی شدت سے تھی کہ خود اللہ تعالیٰ کو بار بار تسلی دینی پڑی کہ آخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود کو اس قدر کیوں گھلا رہے ہیں! گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ نبوت و رسالت کی جو ذمہ داری ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی زیادہ انجام دے رہے ہیں، لگتا ہے آپ اپنی جان ہی گھلا دیں گے:

﴿لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (شاید آپ اپنی جان ہی گھونٹ دیں گے اس بات پر کہ یہ لوگ ایمان والے نہیں بن سکے)۔

نطقِ رسول

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایک اہم امتیاز ہے کہ آپ نے جب بھی کلام کیا وحی الٰہی سے کیا، آپ کی اپنی خواہش یا آپ کی اپنی مرضی کا کوئی دخل نہیں، اگر وحی کا سلسلہ موقوف ہوتا تو آپ بھی خاموشی اختیار کر لیتے، بارہا ایسا ہوا کہ کسی مسئلہ میں آپ کا ذہن الجھا ہوا تھا، یا کفار و مشرکین کی طرف سے اعتراضات کیے جا رہے تھے، یا آپ کے اصحاب کسی سوال کے جواب کے شدت سے منتظر تھے، لیکن آپ خاموش تھے، کیوں کہ اس وقت تک وحی نہیں آئی تھی۔ اس حقیقت کو قرآن کریم یوں ذکر کرتا ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (آپ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتے، وہ تو وحی ہے جو اتاری جاتی ہے)۔

مقامِ رفعت و بلندی

تمام انبیاء کرام کو پوری انسانیت میں سب سے اعلیٰ ہیں، مگر تمام انبیاء میں جو رفعت و مرتبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں آئی وہ کسی دوسرے نبی کے حصہ میں نہیں آئی، ارشاد خداوندی ہے:

﴿ورفعنا لک ذکرک﴾

(اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا)۔

آج دنیا کا کوئی ایسا خطہ نہیں جہاں مسجد کے میناروں سے خدا کی تکبیر کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نام مبارک کی آواز نہ بلند ہوتی ہے!

حضرت حسان بن ثابت نے اپنے انداز میں اس اعلیٰ مرتبہ کو یوں بیان کیا ہے:

و ضم الإله اسم النبی إلی اسمه
إذ قال فی خمس المؤذن أشهد

(اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو اپنے نام نامی کے ساتھ مربوط کر دیا ہے کہ جب پانچ نمازوں کے لئے مؤذن "اشهد" کی ندا لگاتا ہے)۔

اسوۂ حسنہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس انسانی زندگی کے تمام شعبہ ہائے زندگی کے لیے بہتر اسوہ ہے، انسان دنیا کے کسی بھی خطہ کا ہو، کسی بھی نسل کا ہو، کسی بھی رنگ روپ کا ہو، کسی بھی شعبہ یا پیشہ سے وابستہ ہو، زندگی کے کسی مرحلہ میں ہو، اس کے لیے اپنے زندگی کے تمام مسائل کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں موجود ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (بے شک رسول کی ذات تمہارے لیے بہترین اسوہ ہے)۔

صرف اتنا ہی نہیں کہ آپ ﷺ کی ذات مسلمانوں کے لیے ہی اسوہ ہے بلکہ یہ اسوہ ہر مذہب وملت کے افراد کے لیے بھی یکساں قابل تقلید ہے، جو بھی اس کو اختیار کرے گا وہ زندگی کی وسعتوں اور ان وسعتوں میں پھیلی ہوئی خدا کی نعمتوں سے مالامال ہوگا، اور اگر اس اسوہ کے ساتھ وہ ایمان بھی اختیار کرتا ہے تو وہ اس زندگی کے بعد اس زندگی میں بھی کامیاب وسرخرو ہوگا جس زندگی میں کبھی موت نہیں۔

خاتم الانبیاء

اللہ رب العزت نے نبوت کا جو سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع فرمایا تھا وہ سلسلہ آنحضور ﷺ پر تمام ہوتا ہے، گویا اس سلسلہ زریں کی آپ ﷺ وہ آخری کڑی ہیں جس کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنا اس پورے سلسلہ نبوت کی کے خلاف بغاوت ہے، اگر کوئی خود کو نبی کہتا ہے یا کسی کو نیا نبی تسلیم کرتا ہے تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہے اور اس کے سارے اعمال اکارت ہیں۔ آپ ﷺ کی ختم نبوت وختم مرسلینی پر قرآن مجید نے مہر ثبت کردی ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ ٱللَّهِ وَخَاتَمَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ وَكَانَ ٱللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيماً﴾ (محمد تمھارے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر چیز ہے)۔

یہ بعض نمایاں خصوصیات ہیں جو آپ ﷺ کی زندگی میں نظر آتی ہیں، جن کو قرآن کریم نے بہت اہتمام سے بیان کیا ہے، ان خصوصیات کے تناظر میں آپ ﷺ کی مقدس شخصیت کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔

☆☆☆

بقیہ: عصر حاضر کا بحران اور سیرتِ طیبہ کا پیغام

سیرتِ پاک کا پہلا پیغام یہ ہے کہ انسان کے اندر خوفِ خدا اور آخرت کی جواب دہی کا احساس پیدا کیا جائے، جو تمام برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا۔ نبی کریم ﷺ نے انسانیت کے سامنے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ پیش کیا۔ معاشرے میں جب تک سچائی، امانت داری، عفو ودرگزر اور باہمی الفت ومحبت، حیا و پاک دامنی، ایک دوسرے کی عزت واحترام، حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی، معاملات کی صفائی (جو سیرتِ نبوی ﷺ کا بنیادی حصہ ہیں) جیسی صفات پیدا نہیں ہوں گی، ظلم وناانصافی ختم نہیں ہو سکتی۔ نبی کریم ﷺ نے رنگ ونسل اور زبان کے تمام بتوں کو توڑ کر انسانی مساوات کا درس دیا۔ مظلوموں، عورتوں، بچوں اور کمزوروں کے حقوق کا جو تحفظ نبی کریم ﷺ نے پیش فرمایا، وہی عالمی امن اور انسانیت کی فلاح وبہبود کا ضامن ہے۔

عصرِ حاضر کے انسان کو اگر ان فتنوں کے سیلاب سے نکلنا ہے تو اسے مادی تدبیروں کے سراب سے نکل کر محمد مصطفیٰ ﷺ کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہونا پڑے گا۔ جب تک سوسائٹی میں انسانی واخلاقی قدروں کو جگہ نہیں ملے گی، نبی کریم ﷺ کی سیرتِ پاک اور آپ کی پاکیزہ تعلیمات کو سامنے نہیں رکھا جائے گا، اس وقت تک امن وسلامتی کی امید رکھنا بے سود ولاحاصل ہے۔ چاند پر کمند ڈالنے والا انسان جب تک اپنے دل کی دنیا کو اسوۂ حسنہ کے نور سے منور نہیں کرے گا، وہ مادی طور پر جتنا بھی امیر ہوجائے، روحانی طور پر ہمیشہ کنگال ہی رہے گا۔

عصرِ حاضر کے ان عالم گیر فتنوں اور اندرونی خلفشار کے تناظر میں وقت کے حکمرانوں، سیاست دانوں اور مقتدر حلقوں کے لیے سیرتِ پاک میں ایک گہرا اور واضح پیغام موجود ہے۔ ہمارے ملکوں اور معاشروں کی اصلاح محض بیرونی قرضوں، مادی پیکیج، سخت سیکیورٹی قوانین یا چند انتظامی تبدیلیاں کرنے سے کبھی ممکن نہیں ہوسکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک ریاست کا ڈھانچہ، عدالتی نظام اور معاشی پالیسیاں دینِ اسلام کے آفاقی نظام واصول اور سیرتِ طیبہ کے سانچے میں نہیں ڈھلتیں، تب تک امن وامان کا قیام ایک نامکمل خواب ہی رہے گا۔ حکمرانِ وقت کو یہ حقیقت تسلیم کرنی ہوگی کہ ملکوں کی حقیقی ترقی اور استحکام کا راز اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے میں مضمر ہے۔ ظلم و بربریت سے حکومت قائم نہیں رہتی، حکومتوں کی بقا عدل و انصاف اور شفافیت سے وابستہ ہے۔ جب تک امیر اور غریب کے لیے قانون یکساں نہیں ہوگا اور مظلوم کو اس کا حق اس کی دہلیز پر نہیں ملے گا، معاشرے میں بغاوت، سرکشی، ظلم وزیادتی اور درندگی ختم نہیں ہوسکتی۔ اسلام میں اقتدار وحکومت کوئی طمغۂ امتیاز یا عیاشی کا سرٹیفکیٹ نہیں ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے ایک بھاری امانت اور جواب دہی ہے، اور حاکمِ وقت مالک نہیں، بلکہ خادمِ قوم ہوتا ہے۔ جب حکمران خود کو عوام کا حاکم نہیں، بلکہ خادم سمجھیں گے تو ریاستِ مدینہ کا وہ عکس دوبارہ قائم ہوسکتا ہے، جس میں رعایا خود کو محفوظ ترین محسوس کرتی تھی۔

اگر ہمارے حکمران واقعی ملک وملت کو موجودہ بحران، معاشی تباہی، سماجی انارکی، ظلم وستم اور وحشیانہ درندگی سے نکالنا چاہتے ہیں تو انہیں مادی نظاموں کی اندھی تقلید چھوڑ کر قرآن وسنت کی بالادستی اور سیرتِ طیبہ کی تعلیمات کو اپنانا ہوگا۔

☆☆☆

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہ تعالیٰ

Date 25th August, 10th September 2026

تاریخ ۲۵/اگست، ۱۰/ستمبر ۲۰۲۶ء

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اوران بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین ودنیا کی جامعیت اور علم وروحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری وامتیاز کا اعلان واظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون واعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات وعطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
+91-8736833376
پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا